علامہ سید سلیمان ندوی
اور
حیدر آباد آصفی

ایک تاریخی، ثقافتی اور ادبی سبق آموز داستان

از

مولانا غلام محمد

ناشر: بہادر یار جنگ اکادمی
سراج الدولہ روڈ، بہادر آباد، کراچی

علّامہ سیّد سلیمان ندوی

اور

حیدر آباد آصفی

ایک تاریخی ثقافتی اور ادبی سبق آموز داستان

از

مولانا غلام محمّد

*

مصنّف

تذکرۂ سلیمان و حیاتِ بہادر یار جنگ

ناشر

بہادر یار جنگ اکادمی کراچی

یکے از مطبوعات اکادمی سلسلہ ۱۲

اشاعت ـــــــــ اوّل ۲۵ جون ۱۹۸۵ء
تعداد ـــــــــ ایک ہزار
خوشنویس ـــــــــ محمد علی خاں بدایونی
طباعت ـــــــــ ایجوکیشنل پریس کراچی
قیمت ـــــــــ ۲۰ روپے

ـــــ زیر اہتمام ـــــ

سیّد بنیاد علی

مہتمم بہادر یار جنگ اکادمی

ملنے کا پتہ :

بہادر یار جنگ اکادمی

سراج الدولہ روڈ۔ بہادر آباد۔ کراچی

حضرت مولاناؒ کی تصویر اکادمی کے اصرار پر شائع کی جا رہی ہے
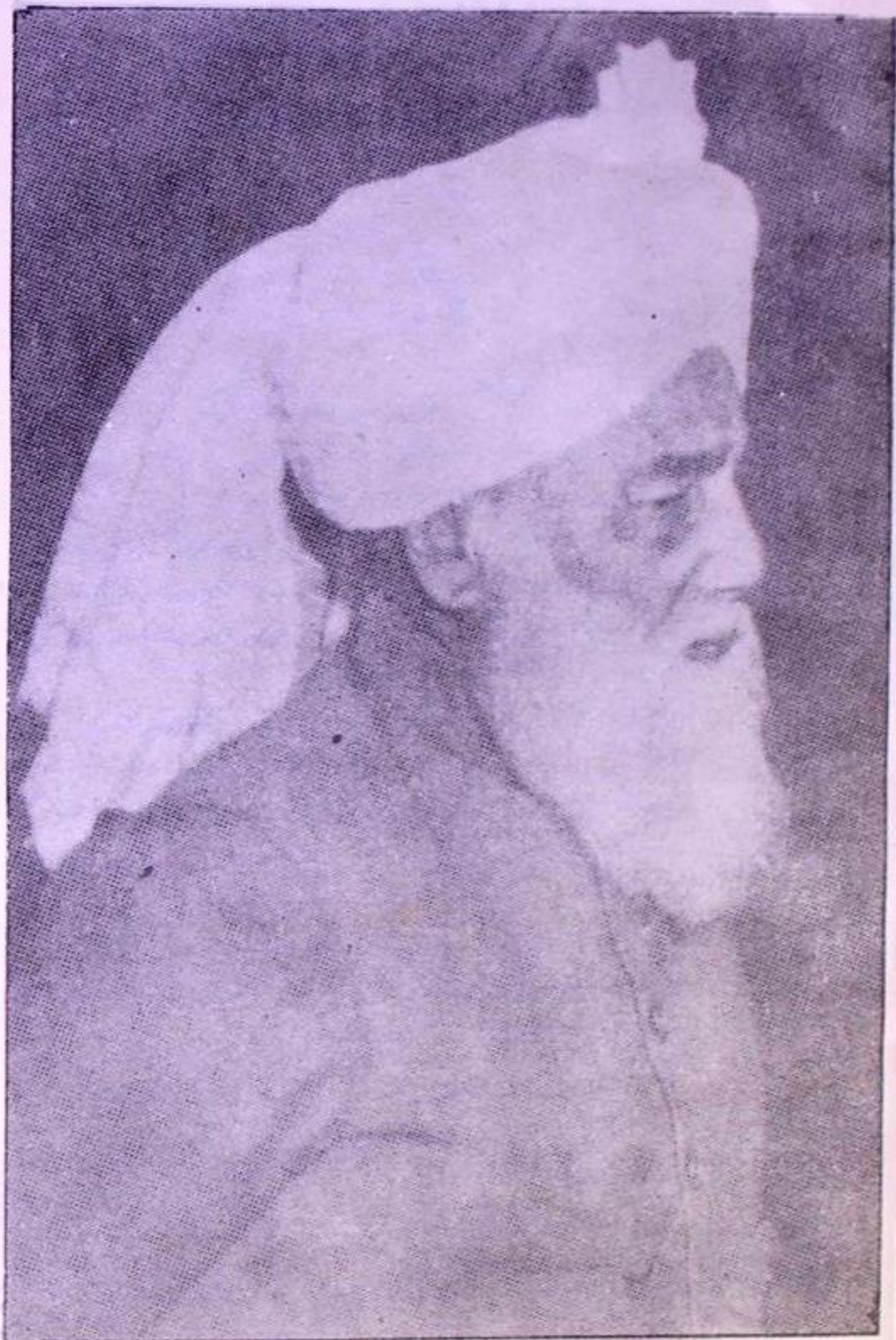
عکسِ شبیہہ حضرت علّامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

عکس خط

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حیدرآباد دکن
۲۴/۲ ۵۳ء

حضرت سیدی ومولائی دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید کہ مزاج والا مع الخیر ہوگا۔

احقر بخیریت ہے مگر سکونِ قلبی سے محروم۔ اس مرتبہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمیشہ ایک بے اطمینانی سی دل پر طاری رہتی ہے اور ظاہرہ اسباب میں بجز حضرت اقدس سے دوری کے کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ہمیشہ کے برخلاف اس مرتبہ اس کا بھی حیرت ہے اور رنج بھی کہ "دستِ شیخ از غائباں کوتاہ نیست" والی بات "محسوس" نہیں ہو رہی ہے، گو عقلاً حضرتِ والا کی توجہات کا یقین رکھتا ہوں۔ حضرتِ والا اس عاجز اور طفلِ طریقت کے حال پر خصوصی توجہ فرمائیں اور دعا سے سرفراز فرمائیں۔

اور حالات لائقِ شکر ہیں۔

محترمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں اور سلمان میاں سلمہ اور ابو عاصم صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے فقط

خادم
غلام محمد عفی عنہ

مودبانہ: جوابی لفافہ برائے رقم [illegible] پیش کر دیگا۔

(حاشیہ پر جواب:)

محب با اخلاص زادکم اللہ [illegible]

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپکا خط مکہ میں ملا تا [illegible]
بیمار ہو گیا الحمد للہ کہ اب [illegible]
بخار، سات روز مکہ میں بخار رہا
مگر ضعف اتنا ہو گیا کہ بخار اتر [illegible]
[illegible] اب تک [illegible] قوت
[illegible] بحمد اللہ [illegible]
ہو رہی ہے۔
آپکے ساتھ معاملہ حاضر و غائب میں
یکساں ہے۔ آپکے خاص تفکرات کے
باعث ایسا محسوس ہوتا ہوگا
میاں نقی آپکی جانشینی کر رہے ہیں
اکثر شام کو آ جاتے ہیں
قربانی میں [illegible] کی مدد کی تھا
نقی نے سب ادا کر دیا۔
والسلام

عہ لفظ "مہینہ" یہاں چھوٹ گیا ہے!

صراحت:- راقم الحروف ڈیڑھ ماہ کے لئے اپنے سابق وطن گیا ہوا تھا، وطن سے یہ عریضہ حضرت علامہ نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اسی پر حضرت سلیمانؒ اور اس مودہ ناتوان کی مراسلت ختم رہی اور الحمد للہ اسی سند کے ساتھ انجام کو پہنچی کہ آپکے ساتھ معاملہ حاضر و غائب میں یکساں رہیگا!

خاکپائے سلیمان غلام محمد

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ برطانوی دورِ حکومت کی بات ہے کہ برصغیر ہند میں چھ سو سے زائد سیاسی حدبندیاں (POLITICAL ENLITIES) ایسی تھیں، جنھیں "دیسی ریاستیں" کہا جاتا تھا۔ یہ اصل میں انگریز کی وضع کردہ اصطلاح NATIVE STATE کا ترجمہ تھا جس میں ایک گونہ تحقیر کا پہلو شامل تھا۔ اگر مصلحتاً ان کی حیثیت کو کبھی بڑھا چڑھا کر بتانا مقصود ہوتا تو انگریز انہیں PRINCELY STATES (ریاست ہائے راجگان) یا INDIAN STATES (ہندوستانی ریاستیں) کہہ دیا کرتا تھا۔ ان ہی ریاستوں میں آصف جاہی حیدر آباد کو بھی شمار کر لیا جاتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قانون، دستور اور معاہدات کی رو سے "نظام کے حیدر آباد" کا موقف ان ریاستوں سے بالکل مختلف اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد تھا۔ وہ ایک "ریاست" نہیں بلکہ "خود مختار مملکت تھی" جس کا اپنا نظام سکہ سازی، نظام رسل ورسائل، (ڈاک) نظام حمل ونقل، نظامِ قانون، نظامِ عدل وانصاف اور دستورِ حکومت تھا۔ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے بھی ان ریاستوں میں سے کوئی بھی اس کے "ٹکر" کی نہ تھیں۔ یہ سب باتیں اس کی امتیازی خصوصیات تھیں، لیکن اصل مابہ الامتیاز چیز اس کا اپنا معاشرتی ماحول، سماجی شعور یعنی باہمی میل جول و یگانگت اور معیارِ تہذیب وشرافت تھا۔ گو آبادی نسلی ولسانی اعتبار سے ترنگی تھی یعنی یہاں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، تلنگے بھی تھے، مرہٹے اور کنڑے بھی لیکن سب تھے باہم شیر وشکر، صوبائی عصبیت، نسلی ولسانی منافرت تو انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ اُردو گو سرکاری زبان تھی،

مگر تھی سب کو عزیز۔ اُردو بولنا اور لکھنا شائستگی کی نشانی تھی تو شیروانی پہننا شرافت کی علامت! آریہ سماجی تحریک نے آصف جاہی حیدرآباد کے بالکل آخری زمانہ میں ہندوؤں میں مذہبی تعصب کو سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر گو اُبھار دیا تھا، مگر اس سے قبل "ہندو مسلم فساد" سے حیدرآبادیوں کے کان آشنا نہ تھے۔ یہ سب کچھ ممکن اس لیئے ہوا تھا کہ اقتدار دو سو برس سے زائد عرصہ سے ایک مسلم حکمران خاندان یعنی آصف جاہی خاندان کے ہاتھوں میں چلا آ رہا تھا۔ آبادی کے تمام طبقوں میں اعتدال و توازن، ملک میں امن و امان و خوشحالی اسی "مسلم اقتدار" کا کرشمہ تھا اور یہ "مسلم اقتدار" ہی آصف جاہی حیدرآباد کا طرۂ امتیاز تھا!

حیدرآباد کا یہ "مسلم اقتدار" مملکتِ دکن کے لیئے ابرِ رحمت تو تھا ہی، مسلمانانِ برصغیر ہند کے لیئے بھی "نشان منزل" ثابت ہوا۔ وہ انھیں اس تاریخی حقیقت کی یاد دلاتا تھا کہ وہ اس برصغیر ہند میں تاجرانہ حیثیت سے مال بدوش نہیں بلکہ سپاہیانہ حیثیت سے شمشیر بکف داخل ہوئے تھے۔ جانوں کا نذرانہ دے کر انھوں نے فاتحانہ مقام حاصل کیا تھا اور مسلم اقتدار کا جھنڈا لہرایا تھا، جو کئی سو سال لہراتا رہا۔ پھر ان کی بداعمالیوں، عیش کوشیوں اور بدمستیوں نے اس پرچم کا سایہ اتنا گھٹایا، اتنا گھٹایا کہ وہ معدوم ہو کر رہ گیا۔ ذلت و نکبت، محکومی و غلامی کی سیاہ رات ان پر مسلط ہو گئی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آصف جاہی حیدرآباد کا "مسلم اقتدار" درویش کی کٹیا کا ایک "دیا" تھا۔ جو درماندہ کاروانِ ملتِ اسلامیہ ہند کو ان کی منزل مقصودگی طرف چلنے کا اشارہ کر رہا تھا ——— حریت و آزادی کی منزل عظمت و حشمت اور اقتدار کی منزل اور وہ منزل جس نے بالآخر نام "پاکستان" کا پایا! اسی لیئے میں آصف جاہی حیدرآباد کو مملکتِ اسلامیہ پاکستان کا "پیش رو" (FORE RUNNER)

قرار دیتا ہوں۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جب شمالی ہند کے لال قلعہ میں مسلم اقتدار کا چراغ گل ہونے کے قریب تھا، تو اسی کی لَو سے اورنگ زیب عالمگیر کے تربیت یافتہ ایک کمانڈر اور جری مدبر (آصف جاہ اول) نے جنوبی ہند کے بالاحصار میں ایک شمع روشن کی، جو دو سو سال سے زائد مسلمانانِ برصغیر کے لیے مشعلِ راہ بنی رہی ـــــ پھر جب مشیتِ ایزدی کو یہ منظور ہوا کہ "مسلم اقتدار" کا آفتاب، شمال مغرب اور شمال مشرق میں پاکستان کی صورت میں طلوع ہو تو جنوبی ہند کی یہ شمع بجھا دی گئی! اقبال نے سچ ہی تو کہا تھا۔

جہاں میں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے!!

ملّتِ اسلامیہ ہند کی تاریخ پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانانِ برصغیر کا تصورِ حکمرانی سلطان شہاب الدین محمد غوری کے داخلۂ ہند سے لے کر ۱۹۴۷ء تک گو کبھی جگمگاتا رہا، کبھی گہنا گیا، کبھی مدھم پڑا مگر ذہنوں سے یکسر محو کبھی نہیں ہوا ـــــ دورِ عروج میں تو یہ تصور "شعوری" تھا، مگر دورِ تنزل میں یہ "لاشعور" میں دبا پڑا رہا، تاہم اس دور میں بھی اس کو بیدار رکھنے بلکہ ایک گونہ مہمیز دینے کا کام آصف جاہی حیدرآباد نے انجام دیا تاآنکہ یہ دبا ہوا ادراک PERCEPTION "لاشعور" سے نکل کر "دائرہ شعور" میں آگیا اور پژمردہ تصورِ حکمرانی نے ایک مرتبہ پھر انگڑائی لی اور تازہ و توانا ہو کر پاکستان کے قالب میں دوبارہ جلوہ گر ہو گیا یعنی آصف جاہی حیدرآباد نے ملّتِ اسلامیہ ہند کی تاریخ کے نازک دور میں "مسلم اقتدار" کے تصور کو کسی نہ کسی صورت میں نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا بلکہ وہ اس کو پوری آب و تاب سے جلوہ فرما کرنے کا ایک مستقل ذریعۂ اثر آفرینی

(SOURCE OF INSPIRATION) بنا رہا! ——— یہی آصف جاہی حیدر آباد اور پاکستان کے مابین نفسیاتی رشتہ یا روحانی و معنوی مناسبت ہے !!

اس زاویۂ نظر سے دیکھئے تو حیدر آباد کی اجتماعی زندگی کے کسی پہلو کا تذکرہ کسی "قصۂ پارینہ" کی "باز خوانی" نہیں ہے کہ اس سے "داغ ہائے سینہ" کو "تازہ" رکھا جائے۔ یہ دراصل اُمّتِ مسلمہ برِ صغیر کے عہدِ رفتہ کی ایک امانت ہے، جس کو پاکستان کے حوالے کرنا دیانتداری کا تقاضا ہے کیونکہ پاکستان ہی اس تہذیبی ورثہ (CULTURAL HERITAGE) کا حقیقی وارث ہے۔

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُمّتِ مسلمۂ ہند کے دورِ تنزل میں ان کے تہذیبی ورثہ کا محافظ و نگہبان آصف جاہی حیدر آباد تھا اس نے اغیار کی ثقافتی یلغار سے بچانے کے لیے اس کے اردگرد مسلم اقتدار کی نہ صرف فصیلیں کھڑی کیں بلکہ اس کی نشو و نما کے انتظامات بھی کیے۔ اسلامی تہذیب کا حقیقی سرچشمہ علوم اسلامی ہیں۔ حیدر آباد نے اس سرچشمہ کے سوتوں کو نہ صرف خشک ہونے سے بچایا بلکہ ان کو گرد و غبارِ زمانہ سے صاف کر کے از سرِ نو آبیاری کے قابل بنایا۔ جس کی ایک روشن مثال "دائرۃ المعارف" کا قیام تھا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا، جو مسلمانانِ عالم کی علمی و تہذیبی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ پھر مملکت کے اندر ہی نہیں باہر بھی علمائے کرام کی سرپرستی اور علمی اداروں کی مستقل امداد و اعانت آخری دور تک جاری رہی یہی وہ خدمات تھیں، جن کی وجہ سے حیدر آباد کی یہ مسلم مملکت علمائے دین اور حاملانِ شرعِ متین کا مرکز و مرجع بن گئی تھی۔ اسی جماعتِ رُشد و ہدایت کے گُلِ سرسبد علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ بھی تھے۔ سید موصوف کون تھے؟ سیرت نگارِ رسول! یہ تو سبھی جانتے ہیں، لیکن وہ کیا تھے؟ اس کو

عاشقِ رسول، علامہ اقبال کی زبان سے سُنیئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی۔

"استاذ الکل" اور "جوئے شیر علم کے فرہاد"

تھے۔ انھوں نے آصف جاہی حیدر آباد کو جیسا کچھ دیکھا اور پایا اس کی جھلکیاں آپ کو آئندہ اوراق میں نظر آئیں گی۔

علامہ موصوف ہی کے ایک ہم مذاق وہم جلیس اور اسی طائفہ دگرامی کے رکن رکین صدق کے مدیر شہیر، مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے مرحوم مملکت اسلامیہ آصفیہ حیدر آباد کی جو تصویر اپنے سحر نگار قلم سے بنائی تھی، اس کو ستمبر ۱۹۷۷ء کو اکادمی کی جانب سے "تاثراتِ دکن" کے زیرِ عنوان پیش کیا جا چکا ہے اور اب آصف جاہی حیدر آباد کے بارے میں سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات ان کے مرید خاص وخلیفۂ مجاز مولانا غلام محمد صاحب رکن مجلس نظما و مجلس انتظامی بہادر یار جنگ اکادمی نے قلمبند کیے ہیں۔ گویا "زبان" مولانا کی ہے تو "بات" علامہ کی! اور بعض مواقع پر خصوصاً جہاں رسالہ "معارف" کے اقتباسات دیئے گئے ہیں، زبان وبیان دونوں ہی علامہ کے ہیں۔ سچ تو یہ ہے مولانا غلام محمد صاحب نے یہ علمی وتحقیقی کام انجام دے کر اپنے مرشد اور مولد دونوں کا حق ادا کر دیا اور کارکنانِ اکادمی پر احسان یہ کیا کہ اس تہذیبی ورثہ کو پاکستان تک پہنچانے کی سعادت میں انھیں شریک کر لیا۔ کتاب کی ضخامت کے "کم" ہونے پر نہ جائیے کہ مولانا کا قلم ایجاز رقم ہے، گو بعض بعض مقامات پر دل یہ چاہتا تھا کہ مولانا اطناب سے کام لیتے تاکہ علم کے پیاسوں کی تشنہ کامی رفع ہو جاتی خصوصاً حیدر آباد کے آخری ایام کے متعلق حضرت علامہ کی زبانی اندرونی سازش کے تذکرہ سے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تفصیل نہ پاکر ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال یہ کتاب ضخامت کے اعتبار سے چھوٹی ہونے کے باوجود اپنی معنویت وافادیت کے لحاظ سے بڑی وقیع ہے۔ بقامت کہتر بقیمت بہتر کی

صحیح مصداق! توقع ہے کہ ملت پاکستان کو اس سے بیش از بیش فائدہ پہنچے گا اور وہ ماضی کے اس تہذیبی ورثہ سے اپنے مستقبل کو تابناک اور درخشاں بنائے گی اور یہی اکادمی کی اس پیش کش کا مقصد ہے۔

وما توفیقی اِلّا باللہ

محمد احمد خاں
میر مجلس
بہادر یار جنگ اکادمی

کراچی
۲۰ جون ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غایت تالیف

اس مختصر سی پیش کش کی دو جہتیں ہیں، ایک ذاتِ سلیمانی کی اور دوسرے وطن سابق حیدرآباد دکن کی، مگر اس کا محرک نہ ہیرو ورشپ کا جذبہ ہے نہ وطن پرستی کا بلکہ صرف احسان شناسی کا، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہٗ سے مجھے صحت و تقویتِ ایمانی ملی۔ عشقِ الٰہی کا چسکا لگا۔ محبت و اتباعِ محمدی کا ذوق حاصل ہوا۔ اعتقادیات، ایقانیات بن گئے، ان احسانات کا کچھ بھی حق ادا نہ کروں؟ اسی طرح قضا و قدر نے میری نمود حیدرآباد دکن کی خاک سے مقدر کر دی۔ آنکھیں کھلیں تو غلامانہ رجحانات سے پاک آزاد، متمدن، مہذب معاشرہ پایا۔ شعور کی پرورش کو مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ کی بے مثل آغوش ملی۔ یہاں بے تعصب علمی ذوق ملا، فکر کو صحیح سمتیں ملیں۔ کیا ان انعامات کو فراموش کر جاؤں؟ ناشکرا بنوں؟ لہٰذا ایک تقاضا تو ان جذبات اور احساسات کا تھا کہ علامہ ندوی اور حیدرآباد کے موضوع پر قلم اٹھاؤں۔

دوسرا محرک یہ رہا کہ آصف جاہی اقتدار، ہند میں مسلم اقتدار کی تاریخ کا زائد از دو صد سالہ سنہری دور تھا، آصفی حیدرآباد مغلیہ اقتدار کی خصوصیات کا نہ صرف محافظ تھا۔ بلکہ وقت کے تقاضوں کو پہچان کر اس میں اس نے خوش آئند اضافہ کیا تھا۔ اب پاکستان کو اپنا رشتہ سابق حیدرآباد سے پیوستہ رکھ کر آصفی اقتدار کی خوبیوں کی محافظت اور مطالباتِ وقت کی تکمیل کے لیے تعمیری اضافے کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ماضی قریب کے مسلم اقتدار کی جو یادداشتیں بھی مل سکیں

ان کو قدر کے ہاتھوں لیا جاتے۔ اِدھر برطانوی ہند میں جو بالغ نظر، غمخوارِ ملّت اور رہبرانہ اہلیت کے علماءِ عظام پیدا ہوتے۔ جیسے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ۔ امامِ معقولات، مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبدالباری انصاری فرنگی محلی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ۔ ان میں علامہ سید سلیمان ندوی کا نام اور عالم اسلام میں اور دنیائے استشراق میں ان کا کام ہوشیار نگاہ میں صبح صادق کی طرح روشن ہے، ایسی ہستی کا جو بے غرض اور مصلحانہ تعلق حیدرآباد، اس کے والی، اس کے اعیان و امراء، اس کے علماء و اہل کمال اور اس کی مسلم قیادت سے رہا۔ اس کی ہر اطلاع اپنے اندر بڑی افادیت رکھتی ہے، ایسی افادیت جو سقوط حیدرآباد کے سانحہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ آج بھی موجود ہے اور کل بھی باقی رہے گی۔ اسی لیے "علامہ سید سلیمان ندوی اور حیدرآباد آصفی" کی روداد آپ کے ہاتھوں میں دی جا رہی ہے اور التماس ہے کہ اس پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے۔

اس تالیف کی تیاری میں ماہنامہ معارف کے متعلقہ شماروں کی تلاش و فراہمی میں عزیزی سید خالد سلمہٗ ایم۔ اے (صحافت) اور علم دوست اور کریم النفس تاجر محترم عبدالشکور نوسی والا صاحب نے میری اعانت فرمائی ہے، میں دل سے ان کا ممنون ہوں۔

اللہ کرے کہ یہ سعی مشکور ٹھہرے اور ایک عاجز کا مقصد تحریر پورا ہو۔

ناچیز
غلام محمد
جمعہ۔ ۲۷ رجب ۱۴۰۵ھ
م۔ ۱۹ اپریل ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ سید سلیمان ندوی اور حیدر آبادِ آصفی

نادر شاہ کا تازیانہ کھا کر بھی جب مغل تاجدار محمد شاہ کی بدمستی نہ گئی تو مرکز سے مایوس ہو کر دکن کے گورنر میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے ــــ جو اورنگ زیب کی تربیت میں رہے تھے اور اورنگ زیب ہی کی ذات جن کا معیارِ نظر تھی [۱]۔ دکن میں آزاد اسلامی سلطنت کی بنا ڈالی۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

اس وقت جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا آفتاب ڈوب رہا تھا اس نظام شمسی سے ایک ستارہ ٹوٹ کر ایک اور نظام شمسی بجائے خود بن گیا، اس کا نام نظام الملک آصف جاہ اوّل ہے جس نے کم از کم ہندوستان کے ایک اہم حصّہ کو اپنے زیرِ علم لا کر اس سرزمین میں اسلام کے علم کو پھر سے بلند کر دیا۔" [۲]

یہ آصفی اقتدار ۱۷۲۴ء سے ۱۹۴۸ء کے ستمبر تک کل ۲۳۱ برس قائم رہا [۳]۔ اس کے آخری تاجدار جلالۃ الملک نواب میر عثمان علی خاں دراصل دسویں بادشاہ مگر آصف جاہ کا خطاب رکھنے والے ساتویں (سابع) حکمراں تھے [۴] جو ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو سریر آرائے مملکت آصفیہ ہوئے [۵]

---

[۱] تاریخ دکن (عہد حالیہ) از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صفحہ ۵ [۲] تقریظ بر حیاتِ آصفیہ از محمد محبوب جنیدی ص ۳ [۳] دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی [۴] ایضاً ص ۱۳۲ آصف جاہ اوّل کے بعد اُن کے یکے بعد دیگرے تین جانشین ناصر جنگ، مظفر جنگ اور صلابت جنگ چونکہ آصف جاہ کے خطاب سے محروم تھے اس لیے چوتھے جانشین "آصف دوم" کہلائے [۵] "تاریخ دکن ص ۲۱۳

مولانا شبلی نعمانی کا پہلا سفر حیدرآباد ۱۸۹۱ء میں ہوا تھا[1]۔ پھر وہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک نظامت سررشتہ علوم وفنون کے عہدے پر فائز رہے تھے[2]۔ اس کے بعد گو مولانا نے حیدرآباد کی مستقل سکونت ترک فرمادی تھی مگر آخر میں پھر پختہ ارادہ فرمایا تھا کہ حیدرآباد میں رہ کر سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد مکمل کرلیں گے اور اس کے لیے اپنے معتمد علیہ شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی وہیں بلوالیں گے[3]۔ مگر مشیت الٰہی شامل حال نہیں ہوئی اور نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ لانے کے لیے انھوں نے علامہ کو حیدرآباد بھیجا[4]۔

تعلق کی مدت اور کل سفر

حیدرآباد سے علامہ کا تعلق ۱۹۱۱ء میں قائم ہوا اور سقوطِ مملکت آصفیہ پر اس کا خاتمہ ہوا، اس دوران وہ کئی مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے، ہمیں جن اسفار کی اطلاع اور روداد مل سکیں وہ یہ ہیں۔ پہلی بار ۱۹۱۱ء میں، دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں، تیسری دفعہ ۱۹۳۵ء میں، چوتھی بار ۱۹۳۰ء میں، پانچویں مرتبہ ۱۹۴۰ء میں، چھٹی دفعہ ۱۹۴۴ء میں اور ساتویں یا آخری بار ۱۹۴۵ء میں۔

یہ راقم عاجز کی ممکنہ تلاش کا حاصل ہے۔

---

[1] حیات شبلی ص ۱۸۲ [2] ایضاً ص ۳۶۸ [3] مکاتیب شبلی (دوم) ص ۴۷ تا ۴۹ [4] یادرفتگان ص ۱۷ زیر عنوان "آہ عماد الملک مرحوم" نیز ص ۳۳۲ زیر عنوان "درویش شاہ جلیل"

پہلا سفر بعہد آصف سادس

علامہ کا پہلا سفر مولانا شبلی نعمانی کے حسب ایمار مارچ ۱۹۱۱ء میں بعہد آصف سادس ہوا نواب میر محبوب علی خاں غفران مکان کی حکمرانی کا آخری زمانہ تھا جو پانچ ماہ بعد ختم ہوگیا، اس وقت علامہ کی عمر ۲۷ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مقصدِ سفر صرف یہ تھا کہ نواب عماد الملک کا وہ کتب خانہ ندوہ لے جایا جائے جو انگریزی تصانیف پر مشتمل تھا۔ حیات شبلی صفحہ ۷۹۵ پر یہ صراحت خود علامہ کے قلم سے ملتی ہے کہ:-

"انھوں نے (یعنی نواب عماد الملک نے) مولانا (شبلی) ہی کے تعلقات کی بنا پر اپنا انگریزی کتب خانہ (ندوہ) کو عنایت فرمایا تھا" سطر ۱۱، ۱۲)

اس سفر کی مزید تفصیل نواب عماد الملک مرحوم اور فصاحت جنگ جلیل مرحوم کے انتقال پر علامہ کے تحریر فرمودہ وفیات میں یہ ملتی ہے:-

"مرحوم (عماد الملک) نے مولانا شبلی کی تحریک سے اپنا جو کتب خانہ ندوہ کو دیا تھا، اس کتب خانہ کو حیدر آباد سے لانے کے لئے مولانا مرحوم نے میرا انتخاب کیا، چنانچہ سب سے پہلی دفعہ میں حیدر آباد روانہ ہوا۔ جناب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی کے یہاں، جو میرے وطن کے قریب کے اور عزیز بھی تھے اور مولانا کے دوست تھے، قیام ہوا اور انھوں نے مولانا شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق نواب صاحب سے جاکر ملایا اور اس سلسلہ سے تقریباً ایک مہینہ تک نواب صاحب کے پاس روزانہ آنے جانے کا کام جاری رہا، وہ ایک ایک کتاب نکال کر مجھے دیتے تھے اور میں اس کو علیحدہ رکھتا جاتا تھا، اس کے بعد سے آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ

برابر جاری رہا۔[1]

تاریخِ سفر کی وضاحت اس عبارت نہیں ملتی :-

"خاکسار کو سب سے پہلی دفعہ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ لانے کے سلسلے سے حضرت الاستاذ مرحوم کے حسبِ ایما حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔"[2]

یہ سفر گویا نجی نوعیت کا تھا اور عام طور پر حیدر آباد کے امراء، اعیان اور علماء سے تعارف کی نوبت اس سفر میں نہیں آئی۔

آصف سابع کے حضور سیرۃ کی پیش کش

اگست ۱۹۱۱ء میں آصف سابع اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں زمامِ حکومت سنبھال چکے تھے، فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ خاں مرحوم (خلیفہ مجاز حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ) جیسی جامع شریعت و طریقت ہستی کے زیرِ تربیت رہ کر اعلیٰحضرت میں جذبۂ دینی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس واطہر سے شیفتگی پیدا تھی۔ اسی جذبہ سے انھوں نے مولنٰا شبلی نعمانی کا ماہوار وظیفہ جو پہلے ایک سو روپے کلدار تھا۔[3] اپنی تخت نشینی کے بعد بڑھا کر تین سو روپے کر دیا تھا۔[4] سیرۃ النبی کی پہلی جلد گو مولانا شبلی مکمل کر چکے تھے مگر ان کی حیات میں وہ چھپ نہ سکی تھی، اس کی اشاعت ان کے جانشین علامہ سلیمان کے ہاتھوں اگست ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔[5] سیرۃ کے مبارک کام میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ والی ریاست بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے اور پھر اعلیٰحضرت آصف سابع نے لیا تھا کہ مولانا شبلی کا تین سو روپے ماہوار کا شخصی وظیفہ دار المصنفین اعظم گڑھ کو منتقل فرما دیا تھا۔ اس لیئے علامہ نے

---

[1] یادِ رفتگان ص ۲۰۷ [2] ایضاً ص ۳۳۲ [3] حیاتِ شبلی ص ۲۷۱ [4] ایضاً ص ۶۵۱
[5] حیاتِ سلیمان از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۶۸ تا ص ۱۷۱

ہز ہائینس والیہ بھوپال اور جلالۃ الملک آصف سابع کو سیرۃ النبیؐ کی اوّلین اشاعت کے نسخے پیش فرمائے۔ حضور نظام نے اس کتاب کو حسبِ محبت و عقیدت سے لیا اور اس کی قدر دانی کی، اس کا اندازہ علامہ کی اس تحریر سے ہوتا ہے ماہنامہ معارف بابتہ ۱۹۱۸ء کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اعلیٰ حضرت ناصر الاسلام والمسلمین ہز اکز لٹڈ ہائینس شہریار دکن خلد اللہ ایام دولتہ کی پیش گاہ معلیٰ میں سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات کا ایک نسخۂ خاص دو مہینے ہوئے ارسال کیا گیا تھا ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اعلیٰحضرت کی خدمت میں جب یہ کتاب پیش ہوئی تو نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ جب تک اس کتاب کو ختم نہ کرلوں گا، دوسرا کام نہ کروں گا۔ یہ کلمات اس حقیقی عقیدت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں جو شہریار دکن کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ہے، اور یہ ہم خادمان بارگاہِ نبوت کے لیئے بڑے فخر و انبساط کا باعث ہے"[1]

جامعہ عثمانیہؔ سے تعلق خاطر

نصاب تعلیم کے معاملہ میں علاّمہ سید سلیمان ندوی خود بڑے ڈائنمک (DYNAMIC) ذہن کے ماہر تعلیم تھے، شبلی کی جودت فکری نے ان کے اس جوہر کی جلا بخشی کی تھی۔ حیدرآباد کی مشہور درسگاہ دارالعلوم جس کا الحاق مدت سے پنجاب یونیورسٹی سے تھا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے ختم ہوگیا[2] اور اب آزاد دارالعلوم کے لیئے جدید اور ایک جامع نصاب تعلیم کی ضرورت پیش آئی، اس سلسلہ میں جہاں اور ماہرین سے تجاویز لی گئیں۔ مولانا شبلی سے بھی رجوع کیا گیا۔ چنانچہ مولانا نے اس کا مفصل خاکہ پیش فرمایا۔ اس کے متعلق علاّمہ نے لکھا ہے کہ:۔

---

[1] [2] حیات سلیمان از شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۲۸ تا ص ۱۷۱ [3] حیات شبلی ص ۵۰۵

"دارالعلوم کے نصاب تعلیم کی یہ اصلاح درحقیقت وہ پہلا قدم تھا جو جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے لیے اٹھایا گیا اور مولانا کی یادداشت وہ پہلی اینٹ ہے جس کے بعد کو عظیم الشان جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی"۔ [1]

اس طرح مولانا شبلی۔ جامعہ عثمانیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ بھی ایک جہت تھی جامعہ سے علامہ کی گہری دلچسپی کی۔

---

[1] حیات شبلی ص۵۱۱

دوسرا سفرِ حیدرآباد

(معائنہ جامعہ عثمانیہ۔ دارالترجمہ۔ دائرۃ المعارف۔ کتب خانہ آصفیہ)

جنوبی ہند کی مشہور مجلس "مجلس العلماء ترچناپلی" نے علامہ کو ستمبر ۱۹۲۶ء میں اس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا۔ مدراس کے سفر سے فارغ ہوکر اکتوبر ۱۹۲۶ء میں علامہ حیدرآباد تشریف لائے۔ یہاں ہر طبقہ میں علامہ کی شایانِ شان پذیرائی ہوئی۔ اس مرتبہ جامعہ عثمانیہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ جامعہ کی اپنی عمارت نہ تھی۔ بلکہ مختلف عمارتوں میں اس کے کالج اور اقامت خانے تھے۔ علامہ نے جامعہ سے متعلقہ دارالترجمہ کا معائنہ فرمایا دائرۃ المعارف کو دیکھا۔ کتب خانہ آصفیہ کا جائزہ لیا۔ اور حیدرآباد سے لوٹ کر دسمبر ۱۹۲۶ء کے معارف میں اپنے تاثرات قلمبند فرمائے، جو ایک تاریخی وثیقہ ہے ذیل میں معارف کے یہ شذرات، اپنی طرف سے بغلی سرخیوں کے اضافہ کے ساتھ پیش ہیں :-

جامعہ میں فضلائے ہند جمع ہیں

گزشتہ ماہ اکتوبر میں مدراس سے واپسی میں تقریباً دس برس[1] کے بعد حیدرآباد میرا جانا ہوا اور مسلسل ۲۰ روز تک وہاں رہنے کا اتفاق

---

[1] علامہ نے پہلا سفر بالیقین ۱۹۱۱ء میں کیا تھا۔ اب یہاں دس برس پہلے حیدرآباد کے سفر کا ذکر فرمارہے ہیں جس کی تفصیل یا کوئی تحریری ذکر ہم کو مل سکا۔ شاید مختصر سفر رہا ہو اور نجی نوعیت کا ہو، بہرحال جس دوسرے سفر کے یہ تاثرات ہیں سفر اول کے ۱۶ سال بعد لکھے ہے۔

ہوا اور دوران قیام میں شہر کے ارکان و عمائد، اہل علم، اور اہل قلم اصحاب نے نمائندہ دار المصنفین کی جو قدر افزائی کی وہ اس کی توقع سے زیادہ تھی، ان دس برسوں کے اندر حیدر آباد نے جو سب سے زیادہ شاندار ترقی کا منظر پیش کیا ہے وہ اس کا جامعہ عثمانیہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کے توسل سے حیدر آباد میں تقریباً تمام ہندوستان کی روح کھنچ کر آ گئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی انجمن اتحاد کی تقریب میں میں نے ظرافتہً کہا تھا کہ ہم کو ہندوستان میں جو قحط رجال نظر آتا ہے۔ اس کی اصلی وجہ یہاں آ کر معلوم ہوئی یعنی ہندوستان کے فضلا کا بڑا حصہ ہندوستان سے کھنچکر دکن میں آباد ہو گیا ہے اور ہندوستان خالی رہ گیا ہے، اس وقت میرے خیال میں جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کے تعلق سے قدیم اور جدید علوم کے ماہرین کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی اس سے اعلحضرت زماں، رواتے کشورِ دکن کی قدر دانی، مردم شناسی اور علم دوستی کا اندازہ ہوگا، داغ کا مصرعہ معنوی حیثیت سے اب موزوں ہوا ہے۔

حیدر آباد آج کل گلزار ہے

لیکن اس خوشی کے ساتھ ایک غم بھی تھا کہ گو حیدر آباد کے آسمان میں سیکڑوں ستارے چمک رہے ہیں لیکن علم و دانش کا وہ آفتاب غروب تھا۔ جو اس نظامِ شمسی کا مرکز تھا۔ یعنی نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی مرحوم مرحوم اب شہر سے باہر ایک پہاڑی کے دامن میں ایک لطیف و سبک بے سقف کی بارہ دری کے اندر استراحت فرما ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے سرفراز کرے۔

جامعہ ایک کامیاب تجربہ

اس بات میں کوئی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی تجویز توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ اور بالآخر اس طویل فکری مناظرہ کا کہ مغربی علوم و فنون کی تعلیم مادری زبان میں دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اور اردو زبان اس قابل ہے

یا نہیں عملی استدلال سے فیصلہ ہو گیا اور جامعہ عثمانیہ نے ثابت کر دیا کہ مادری زبان ہی میں تعلیم دماغی نشو و نما کے اصلی جوہر کو نمایاں کر سکتی ہے۔ پروفیسروں اور اُستادوں کو کیمیا، طبعیات اور ریاضیات کے دقیق سے دقیق مسئلہ کو اردو اصطلاحات اور زبان میں تعلیم دیتے ہوتے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ طلبہ پر غیر مادری زبان اور مستلر کی وقت کا دوگونہ بار نہیں پڑ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی ہندوستان کو قومی تعلیم کا خیال آئے گا تو عثمانیہ یونیورسٹی ہی اس خیال کا سنگِ بنیاد قرار پائے گی۔

جامعہ میں بہترین اساتذہ جمع ہیں

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ خوش قسمتی سے عثمانیہ یونیورسٹی کو ہر علم و فن کے لئے اچھے سے اچھے اور لائق سے لائق استاد جو اس بازار میں مل سکتے تھے۔ میسر آتے ہیں، اور اس حیثیت سے وہ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے کم مرتبہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ شاید بہت سی سرکاری یونیورسٹیوں سے اس بارہ میں بہتر ہو۔

جامعہ کی بالفعل خود اپنی کوئی عمارت نہیں۔ متعدد بڑی بڑی کوٹھیوں اور کرایہ کی عمارتوں کو جو آس پاس تھیں کرایہ پر لے کر استعمال میں لایا جا رہا ہے، اور کہیں کہیں ان کو تھوڑے تغیر سے مصرف کے قابل بنا لیا گیا ہے اور بعض کمرے تو ایسے موزوں بن گئے ہیں کہ وہ بالکل بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے ہیں خصوصاً تجربہ گاہ جو معلوم ہوتا ہے کہ بالکل اسی غرض کے لئے بنا ہے۔ تاہم اگر جامعہ کے لیئے کوئی خاص عمارت بن جاتے جو زیر غور ہے تو اس کی ظاہری شان و حیثیت بھی دوبالا ہو جائے۔

سائنس کی طرف بڑھتا ہوا رجحان

کیمیا اور طبعیات کے تجربہ گاہ بھی بہت کچھ ترقی یافتہ ہیں یہ سُنکر خوشی ہوئی کہ طلبہ کی تعداد سال بہ سال آرٹس (فنون) کی جگہ علوم (سائنس) میں بڑھ رہی ہے۔ یہیں کے تجربہ گاہ میں وہ نادر زمانہ چیز بھی دیکھنے میں آئی جس کو لوگ ریڈیم کہتے ہیں۔ ایک مختصر کمرہ کو خاص اسی لیئے موزوں کیا گیا ہے۔ ہر طرف دروازہ بند کر کے اور بیرونی روشنی کی درآمد کو سیاہ پردوں سے روک کر جب کوٹھری

بحر ظلمات بنائی گئی اور پھر وہ نور کا ٹکڑا ڈبیہ سے نکال کر جب آنکھ کے سامنے کیا گیا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اندھیری رات میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے تارے آسمان سے گر گر ادھر ادھر فضا میں پھیل رہے ہیں۔

البتہ شعبۂ دینیات کی ناقدری

جامعہ عثمانیہ کا اگر کوئی پہلو قابلِ افسوس ہے تو وہ شعبۂ دینیات ہے۔ اس شعبہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے فاضل استاد ہیں، جن میں سے ایک بھی اگر ہندوستان کے کسی عربی مدرسہ کو میسر آجائیں تو وہ اس کی شہرت کے لیے کافی ہے۔ مگر با ایں ہمہ اس کی طرف طلبہ یا طلبہ کے اولیار کا رجحان نہیں حالانکہ اعلیٰ حضرت نے اپنی غایتِ دین پروری اور قدر شناسی کی وجہ سے اس شعبہ کے طلبار کو حقوقِ ملازمت اور عزت و سند میں وہی درجہ عنایت کیا ہے جو دوسرے شعبوں کے کامیاب طلبہ کو مرحمت فرمایا ہے۔ تاہم ادھر میلان نہیں، اس کو مسلمانوں کی بدبختی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جائے۔

دارالترجمہ کامیابی کا ضامن ہے

جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی کامیابی درحقیقت اس کے دارالترجمہ کی ممنونِ احسان ہے یہی وہ شعبہ ہے جس نے جامعہ کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ مادری زبان میں تعلیم کا اہم کام انجام دے۔ انگریزی، عربی، فارسی کے ضخیم اور دقیق تراجم کا کام یہاں نہایت عمدگی سے انجام پا رہا ہے۔ یہاں کے تراجم اگر اردو کتابوں کے عام بازاروں تک آجائیں تو معلوم ہو کہ اس کے ذریعہ سے اردو زبان کو کس حد تک مالا مال کر دیا گیا ہے۔ سیاسیات طبیعیات، ریاضیات، اخلاقیات، تاریخِ اسلام اور تاریخ یورپ، تاریخِ ہند، جغرافیہ اور علم و فن کی کتابیں تیار ہو چکی ہیں اور تیار ہوتی جاتی ہیں اور اس وقت تک ایک سو کے قریب کتابیں چھپ چکی ہیں۔

دائرۃ المعارف نے حیدرآباد کو عالمی عظمت بخشی

حیدرآباد کی علمی کوششوں کا تیسرا میدان دائرۃ المعارف ہے جہاں سے قدیم مشرقی کتابیں چھپ کر

شائع ہوتی ہیں، یہ دائرہ شاید آج سے تیس برس پہلے ملا عبد القیوم مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم کی کوششوں سے وجود میں آیا اور اس کے ذریعہ سے بہت سی قدیم ونادر عربی کتابیں چھپکر شائقین علم کے ہاتھوں تک پہنچیں اور جنھوں نے نسیم بہار بن کر حیدرآباد کی علم دوستی کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیلادی۔ اس وقت دائرہ میں ایسے محنتی اور جفاکش اور لائق کارکن اور مصححین موجود ہیں، جو اپنے کام کو فرض شناسی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، یہ افسوس ہے کہ دائرہ کی حیثیت ایک غیر سرکاری مجلس کی ہے اور اس کا مطبع بھی اس کی حیثیت سے فروتر ہے اور قلتِ سرمایہ کے باعث کام کرنے والوں کا معاوضہ بھی اتنا نہیں کہ وہ ایسے گراں شہر میں فارغ البالی اور اطمینان سے کام کرسکیں، "گدائے گوشہ نشین کی یہ رائے" رموزِ مملکت میں مداخلت تو نہ سمجھی جائے گی کہ مجلس اشاعۃ العلوم نظامیہ اور دائرۃ المعارف کو ایک کردیا جائے تاکہ دونوں کام ایک نظام میں منسلک ہوجائیں اور دونوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

کتب خانہ آصفیہ ہند کی سب سے بہترین لائبریری ہے!

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کی علمی عمارت کا ستون ہے۔ ہمارے خیال میں کتابوں کی کثرت نوادر کی بہتات، قلمی کتابوں کی کثرت، فائدہ اٹھانے والوں کی کثرت استفادہ کی سہولت اور حسن انتظام کے لحاظ سے یہ ہندوستان کے تمام مشرقی کتب خانوں سے بہتر ہے دس برس کے بعد اس کو اب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کتابیں بڑھتی گئی ہیں، ضرورت

---

[1] علامہ فرماتے تھے کہ کسی ملک کی اصل عظمت اس کی علم پروری میں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ سقوط حیدرآباد کے بعد مستشرقین کی جو پہلی کانفرنس (غالباً مصر) میں ہوتی تھی اسمیں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ حیدرآباد کے دائرۃ المعارف اور دارالترجمہ کی حفاظت کا خاص خیال رکھیں۔

ہے کہ اس کی جدید فہرست نئے اسلوب پر تیار کی جائے۔ موجودہ ناظم کتب خانہ نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے مگر یہ نہایت اہمیت اور دقتِ نظر کا کام ہے۔ اس کے لیے خاص توجہ درکار ہے۔

مکرر تحسین دارالترجمہ معارف اگست ۱۹۳۹ء کے شذرات میں دارالترجمہ کا مکرر ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا دارالترجمہ جو خدمتیں انجام دے رہا ہے، ان سے علم کا کون طالب و شائق واقف نہیں۔ خصوصیت سے جب سے یہاں کی نظامت کی باگ ہمارے فاضل دوست مولوی الیاس صاحب برنی کے ہاتھوں میں آئی ہے، اس سال دارالترجمہ کی طرف سے، ۳ کتابیں تاریخ، فلسفہ، سائنس، طب، معاشیات، نفسیات، نباتات، تعمیرات وغیرہ مختلف علمی شاخوں پر شائع ہوئی ہیں۔ اور دارالمصنفین کو موصول ہوئی ہیں۔ ہم دارالترجمہ کی اس کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔"

ان تاثرات میں آج پاکستانی جامعات بلکہ کل شعبۂ تعلیم اور اس کے بااختیار ارباب کے لیے کتنی فکر اور ہدایت کا سامان ہے۔ هَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ؟ (ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟)!

جلسۂ میلاد، اعلیحضرت کی شرکت اور علّامہ کی تقریر

بلدہ حیدرآباد میں، ربیع الاوّل کے بابرکت مہینہ میں، نواب مصاحب جنگ کے ہاں ہر سال جلسہ میلاد بڑے اہتمام اور اعلیٰ انتظام سے ہوتا تھا جس میں خسرو دکن نواب میر عثمان علی خاں، بڑی عقیدت سے شریک رہتے تھے۔

ایسا ہی ایک موقع تھا، سن ٹھیک طور پر معلوم نہیں البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ عثمانیہ کے کالج شہر ہی میں بارہ سے زیادہ خانگی عمارتوں میں تھے[1] ان کالجوں کی موجودہ جگہ پر منتقلی چونکہ ۳۵-۱۹۳۴ء میں ہوتی تھی[2] اس لئے یوں سمجھنا چاہیئے کہ ۱۹۳۴ء سے قبل کا قریبی کوئی سن ہجری ہوگا جب مصاحب جنگ کی رہائش گاہ پر سالانہ جلسہ سیرت منعقد ہوا، حسب معمول اعلیحضرت اس میں رونق افروز تھے۔ عثمانیہ کالج کے اساتذہ اور سینیر طلبہ کی خاصی تعداد کے علاوہ شہر کے عمائدین، فضلاء اور محبان نبوی صلعم جمع تھے۔ اب کی مرتبہ ہندوستان سے دو چوٹی کے علماء۔ ایک نازش ندوہ اور دوسرا آبروئے دیوبند، ایک سیرت نگار نبوی صلعم اور دوسرا شارح حدیث مصطفوی یعنی حضرت علّامہ سیّد سلیمان ندویؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو اس جلسہ کے مقررین کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

دونوں اکابر کی تقریریں ہوئیں۔ علّامہ ندوی کی تقریر ٹھوس علمی اور تحقیقی انداز کی تھی اور مولانا عثمانی کا بیان خطیبانہ اور واعظانہ رنگ کا تھا۔ ایک میں علمی نکات کی گراں باری تھی اور دوسری میں خطابت کی سحرانگیزی، چنانچہ حضرت مولانا

---

[1] و [2] جامعہ عثمانیہ از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ص ۲۷ و ص ۱

عثمانی نے دوران تقریر جب ضمناً حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو خطیبانہ طرزِ اظہار سے اعلحضرت کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔ انھوں نے سامعین کو چونکا یا

"کون بلال ہے جس کے جوتے کا تسمہ اگر بادشاہ دکن کو مِل جاتے تو وہ اس کو اپنے تاج میں لگا کر فخر محسوس کریں"

اعلحضرت پھڑک اٹھے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا سبحان اللہ سبحان اللہ بہرکیف تقریریں ہو چکیں، جلسہ ختم ہو گیا، جیسا کہ ہوتا ہے اب سامعین میں مقررین اور ان کی تقریروں کے موازنہ کی گفتگو چلی، اہلِ علم علامہ کی تقریر کی برتری کے قائل ہوتے کہ بڑی ہی پُر مغز اور حشو و زوائد سے پاک تقریر تھی، عام حضرات نے مولانا کی تقریر کو برتر قرار دیا کیونکہ حضور نظام اس کے ایک جُملے پر پھڑک اٹھے تھے، مگر خود اعلحضرت سلطان العلوم کے آخری FINAL تاثر کا پتہ ان کے اس جملہ سے چلے گا جو انھوں نے جلسہ سے واپسی پر فرمایا کہ:

مولانا سلیمان کی تقریر مَا قَلَّ وَدَلَّ تھی [1]

یہ پوری روداد راقم نے دو نہایت ثقہ راویوں سے سنی جو اس جلسہ میں شریک تھے، ایک تو مولوی فضل اللہ صاحب مرحوم جو یوسف یار جنگ معتمد (سکریٹری) حکومت سرکار عالی کے ماموں، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے مرید اور میرے والد ماجد کے گہرے دوست تھے، دوسرے عثمانیہ کے فرزند عزیز، مجلس اتحاد المسلمین کے زعیم، استاد قانون اور مشہور مصنف جناب احمد عبداللہ المسدوسی، جو اس وقت عثمانیہ کالج میں قانون کے طالب علم تھے۔ محترم مسدوسی صاحب کی رائے موازنۂ تقادیر کے سلسلہ میں بڑی صائب تھی۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے:۔

"دراصل ان دونوں تقریروں کا موازنہ کرنا ہی میری رائے میں صحیح نہیں، اس لیے کہ دونوں کی نوعیت الگ الگ تھی

---

[1] یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مراد و مدعا پر دلالت کرنے والی تقریر تھی۔

البتہ علامہ سیّد سلیمان ندوی کی علمی گہرائی اور وسعت کا اندازہ ہم کو پہلی بار اسی تقریر سے ہوا۔ اور ہمارے اساتذہ بھی اس اعتراف میں ایک زبان تھے۔ افسوس کہ ایسی علمی، فنی، مدلل اور مربوط تقریر ضبط تحریر میں نہ آسکی!"

تیسرا سفر حیدر آباد

یہ سفر جولائی ۱۹۳۵ء میں ہوا، قتل و قصاص کے قوانین مرتب کرنے کے لیئے علماء کی ایک مجلس بنائی گئی تھی، اس میں شرکت کی دعوت علامہ کو بھی دی گئی تھی، اس سفر کا محرک یہی تھا، علامہ نے قیام حیدر آباد کے دوران معارف بابتہ اگست ۱۹۳۵ء کے لیئے جو شذرات لکھ کر بھیجے تھے، اُن کے اقتباسات ملاحظہ ہوں، جلی سرخیاں راقم کی طرف سے ہیں۔

شرکتِ مجلسِ تدوینِ قانونِ قصاص

"یکم جولائی ۱۹۳۵ء سے خاکسار اڈیٹر سفر میں ہے، چند روز راہ میں بھوپال ٹھہرا اور اب ۸ر جولائی سے حیدر آباد دکن میں قیام ہے اور شاید اس پرچہ کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک اعظم گڑھ کو واپسی ہو، وجہ سفر حیدر آباد میں قانونی قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کی مجلس میں شرکت ہے مجلس مذکور کے اجلاس متواتر ہو رہے ہیں اور شاید دو ہفتوں تک اور رہوں۔" (شذرہ ۲)

علماء کی موقع ناشناسی

"..... اب یہی تحریک سلطنت آصفیہ کی مجلس قانونی میں پیش ہے، مجلس مذکور کے ایک مسلمان ممبر نے ایک مسودہ تیار کیا ہے، جو استصواب کی غرض سے عام طور سے شائع کیا گیا ہے، وہاں کے علماء کی مجلس نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اپنا دوسرا مسودہ تیار کیا ہے لیکن ہنوز علماء عام طور سے اس دوسرے مسودہ کی تائید میں بھی نہیں ہیں، ہم ابھی حنفی اور شافعی اور مالکی کی جنگ میں مبتلا ہیں، اور زمانہ سر سے فقہ اسلامی کی ضرورت سے منکر ہونے پر تُل رہا ہے۔" (شذرہ ۹)

کیا آج بھی ہمارا المیہ یہی نہیں ؟ اور کیا آج بھی علامہ کا آخری جملہ علمائے کرام کے لیے لمحہ فکریہ فراہم نہیں کر رہا ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار !!

جامعہ عثمانیہ کی تعمیرِ نو اور اس کی خدمات

"حیدر آباد کے علمی خزانوں میں پہلے سے بہت اضافہ ہو گیا ہے جامعہ عثمانیہ کے شہر کے باہر بن جانے سے کہنا چاہیئے کہ ایک نیا مدینتہ العلم آباد ہو رہا ہے۔ سرکار آصفیہ اس کی تعمیرات پر جس فیاضی سے خرچ کر رہی ہے اس کی مثال تاریخوں میں بھی نہیں مل سکتی اور ہماری زبان کو اس سرکار دولتمدار کی ان کوششوں سے وہ استواری مل رہی ہے۔ جس کو انشاء اللہ حوادث کا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکے گا" (شذرہ ص۳۰)

کہاں یہ رائے خلدونِ عصر اور اردو زبان کے استادِ فن کی اور کہاں پاکستان کے حیلہ جو حضرات کی حیدر آباد و جامعہ عثمانیہ کے علمی و لسانی ترکہ کی ناقدری اور نتیجتہً پس پا افتادگی۔

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْد۱

جامعہ میں علامہ کی تقریر

اپنی شذرات میں تحریر فرماتے ہیں :-

"پچھلے سال اس مسئلہ پر (یعنی اُردو اور ہندوستانی) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ایک مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے پڑھا تھا۔ اس دفعہ اسی موضوع پر جامعہ عثمانیہ کے یونین میں ایک مفصل تقریر کی تاکہ شمال و جنوب کی دونوں یونیورسٹیوں کے

---

۱ کیا تم میں کوئی بھلا سوجھ بوجھ کا آدمی نہیں۔

سامنے اس نام کی اہمیت نمایاں ہو جاتے، ضرورت ہے کہ اخبارات اور
رسالے جن میں بے عمل معارف بھی داخل ہے. آئندہ سے اُردو کے
بجائے ہندوستانی کو رواج دیں"!

شذرہ ۸

علامہ کی یہ تجویز ــــ جس کی گہرائی اس وقت ہم کو بھی محسوس نہ ہو سکی ــــ روبہ عمل نہ آسکی لیکن آج اردو کے ساتھ جو معاملہ بھارت کے اکثریتی عوام اور خود حکومت کا ہے اس کو دیکھ کر علامہ کی دوربینی اور پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے. مگر اب بات وہی رہ گئی ہے کہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد بیاید بر کلّۂ خود باید زد"!

امرائے حیدرآباد اور اہل حجاز کی خدمت

شذرات کے انہی گراں قدر ٹکڑوں میں ایک شذرہ یہ بھی سپردِ قلم ہوا ہے:۔

"حیدرآباد بھی ایک اسلامی سلطنت ہے، یہ بھی اپنے مقدور بھر اہلِ حجاز کی خدمت بجالاتی ہے لیکن جو چیز زیادہ تسکین دہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں کے متعدد اعلیٰ منصب داروں نے حجاز کی امداد کے لیئے چند غیر سرکاری مجلسیں قائم کی ہیں جن میں یہ مشترک مقصد شامل ہے کہ حرمین محترمین میں ایسے کارخانے اور صنعت گاہیں قائم کی جائیں جن میں حجاز کے ناداروں کو کام میں لگایا جائے اور ان کو اس محنت و مزدوری کے ذریعہ سے فائدہ پہنچایا جائے ہمارے خیال میں اہلِ حجاز کی امداد کی یہ بہترین صورت ہے کیا اچھا ہو کہ یہ کل کام کرنے والے مل کر کام کریں اور ساتھ ہی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس غرض کے لیئے کچھ اشخاص کھڑے ہوں یا معتبر انجمنیں قائم ہوں"!

شذرہ ۱۲

اہلِ ملت کی شیرازہ بندی علامہ کا دلی ارمان اور ان کی زندگی کا مشن تھا بساط بھر

اس کی عملی کوشش بھی کی اور رات کی تنہائیوں میں اس کے لیے مچلتے تڑپتے اور دعائیں کرتے رہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

یہاں تک تو شذرات کے وہ جواہر پارے نقل ہوتے جو قیام حیدرآباد کے دوران تحریر فرماتے تھے، اب دو شذرات وہ درج ذیل ہیں جو سفر سے لوٹ کر ستمبر ۳۵ء کے معارف میں تحریر فرماتے تھے، یہاں بھی عنوان اس مورِ ناتواں کے قلم سے ہیں :۔

راعی و رعایا کی طرف سے علامہ کی قدر و منزلت

۲۱ ماہ اگست کو حیدرآباد کے سفر سے واپسی ہوئی۔ ڈیڑھ ماہ کے قیام حیدرآباد میں دکن کے احباب اور عمائد نے حسبِ محبت سے ذرہ نوازی کی، وہ میرے استحقاق سے زیادہ تھی۔ ہز ایکسیلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر نے خلعتِ پارچہ سے نوازش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلحضرت سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائنس شہریارِ دکن خلد اللہ تعالیٰ ملکہ' و دولتہ نے یاد فرما کر باریابی بخشی، اور الوانِ خاصہ سے سرفراز فرما کر ہمچشموں میں حقیر کی توقیر بڑھائی۔

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را
نظام الملک آصفجاہ عثمان علی خان را

سلور جوبلی کا اہتمام اور ہندو مسلم اتحاد کا مثالی نمونہ

آج کل اعلحضرت شہریار دکن کی بست و پنجسالہ جوبلی کے اہتمام و انتظام کی دھوم دھام ہے۔ دکن کی یہ سلطنت گو دکن کے رقبۂ حکومت میں محدود ہے مگر سچ یہ ہے کہ اُس کے انوار کرم کی تابانی سے ملک ہند کا ذرہ ذرہ روشن ہے وہ اپنی تاریخی روایات کی بنا پر سلطنت مغلیہ کی یادگار، اور ہندوستان کی امیدوں کا چراغ ہے جس امن و امان، عدل و انصاف اور ہندو مسلمانوں کی باہم یکجہتی کے منظر یہاں آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کی سلطنت جب زندہ ہوگی تو اس میں اور کیسے کیسے دلفریب اور دلکش مناظر ہوں گے۔ ضرورت ہے کہ اس تاریخی جشن کے موقع پر جو یکم شوال سے شروع ہوگا، پورا ملک ہند دکن کی اس خوشی مسرت

میں شریک ہو خصوصاً ملک کا تعلیمی و علمی حلقہ جو خاصہ وسیع ہے، اس قدر و قدر افزائی کا اعتراف کرے جو اس فیاض سلطنت کی جانب سے اس کی ہوتی رہی ہے، اور ہوتی رہتی ہے۔

یہ رودادِ سفر یہاں ختم ہو چکی۔

دکن ریڈیو سے تقریر

اس سفر میں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو دکن ریڈیو حیدرآباد نے بھی مدعو کیا، تقریر کا موضوع کیا تھا، پتہ نہ چل سکا۔ اندازہ یہ ہے کہ "حیدرآباد" موضوع رہا ہوگا کیونکہ علامہ کی بیاض میں اُن کا ایک شعر اس عنوان کے ساتھ مجھے ملا:۔

ارمغان سلیمان میں اس خطاب کا اختتامی شعر ہم کو اس صراحت سے ملتا ہے کہ:۔

"در آخر خطبۂ ریڈیو بہ حیدرآباد دکن

سلیماں را بملک شام اگر آصف وزیرے شد
ببیں اینجاست آصف را سلیماں کمتریں چاکر" [1]

[1] ارمغانِ سلیمان ص ۱۰۲ (مرتبہ راقم الحروف)

جامعہ عثمانیہ کے پہلے نتائج امتحان پر علامہ کا تبصرہ

۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑ گئی، ذریعہ تعلیم انگریزی کے بجائے اردو ہوگیا، یہ ایک انقلابی اقدام تھا مگر جہاں تک نصاب کا تعلق ہے، جس پر کسی قوم کے انقلاب کا دارومدار ہوتا ہے، وہ وہی رہا جو برٹش انڈیا کی عام یونیورسٹیوں میں رائج تھا۔ البتہ شعبہ دینیات اور مقامی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم کا اضافہ کردیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب اس جامعہ کا پہلا امتحان ہوا اور اس کے نتائج شائع ہوئے تو علامہ نے معارف کے شذرات میں نہایت معتدل اور تعمیری تنقید کے ساتھ جو تبصرہ فرمایا تھا اس کی افادیت پر کہنگی کا اثر آج تک نہ آسکا بلکہ آج بھی اس میں ارباب تعلیم کے لئے بصیرت کا سامان ہے۔

وہ شذرات یہ ہیں:۔

"الحمدللہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد دکن) نے بارآوری شروع کردی۔ میٹریکولیشن کے امتحانات تو کئی سال سے ہورہے تھے، اس سال انٹرمیڈیٹ کا بھی پہلا امتحان لیا گیا جس کے نتائج اسی مہینہ میں انگریزی و اردو اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔

ان نتائج میں جہاں تک ظاہری پہلو کا تعلق ہے ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کو دیکھتے ہوئے دو باتوں میں نمایاں ترقی ہے۔ ایک تو یہ کہ نتیجہ جلد ظاہر ہوگیا، اوائل مئی میں امتحانات ختم ہوئے تھے اور غالباً اوائل جون ہی میں طلبہ کو اپنے مستقبل کے بارہ میں یکسوئی حاصل ہوگئی ہوگی، دوسرے یہ کہ انٹرمیڈیٹ میں کامیاب طلبہ کا تناسب نہایت ہی حوصلہ افزا ہے، یعنی ۱۱۶ میں صرف ۲۸ ناکام رہے

ان ۲۸ میں بھی ۱۳ وہ ہیں جو خانگی (پرائیویٹ) طور سے شریک ہوتے تھے اور کالج کی تعلیم سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ البتہ میٹریکولیشن میں خانگی طور سے شریک ہونیوالے امیدواروں کو نکال کر بھی کامیابیوں کا تناسب (۳۳ء) فیصدی ہے جس کے اسباب کی تحقیق و اصلاح یقیناً یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی توجہ کی طالب ہے ۵۷۶ طلبہ میں (گو ان میں خانگی شرکا بھی شامل سہی) ۴۵۹ کا فیل ہوجانا قطعی ایک قتل عام ہے۔

امتحان، نصاب تعلیم اور طرز تعلیم وغیرہ میں اگرچہ عثمانیہ یونیورسٹی سردست (شاید بعض عارضی مصالح کی بنا پر) دیگر ہندوستانی یونیورسٹیوں ہی کے ناقص نظام کی پیروی کر رہی ہے لیکن ذریعہ تعلیم اجنبی زبان کے بجائے ملکی زبان کو قرار دینا جس پر اس یونیورسٹی کی بنیاد ہے ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ میں ایک ایسا اہم اصلاحی قدم ہے جس کی بنا پر تمام ملک کی نگاہیں اس کی جانب لگی ہوئی ہیں اس لیے اگر نتائج امتحان کے ساتھ اُن نتائج کی بھی جو مادری زبان میں تعلیم دینے سے تجربہ میں آتے ہوں گے۔ ایک مختصر رپورٹ شامل ہوتی تو مناسب تھا۔

ایک اور بڑی کمی علی العموم یونیورسٹیوں میں یہ ہے کہ خود ہندوستانی و مشرقی علوم والسنہ کے ساتھ غایت بے التفاتی برتی جاتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے نتائج منتہی ان کے ساتھ اختیاری مضامین کی جو فہرست ہم کو موصول ہوئی ہے، وہ خود بھی اگرچہ اس نقطہ نظر سے نہایت ہی مایوس کن ہے۔ تاہم تاریخ اسلام اور دکنی زبانوں (تلنگی، مرہٹی، کنڑی) کے نام اس میں نظر آتے ہیں، جو دوسری یونیورسٹیوں (الا ماشاء اللہ) کی فہرست مضامین میں نہ ملیں گے۔

تاریخ اسلام لینے والے طلبہ کی تعداد بھی خاصی ہے یعنی ۱۰۲۱ البتہ عربی اور سنسکرت لینے والوں کا اوسط وہی ہے جو کم و بیش دوسرے کالجوں میں رہتا ہے۔ یعنی

یعنی علی الترتیب ۸ اور ۴

یادش بخیر، غالباً اسی کمی کو پورا کرنے کے لیئے عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک مستقل "شعبہ مشرقی" کے قیام کا اعلان کیا تھا جس کے معلمین کے نام بھی شاید سرکاری گزٹ میں شائع ہو گئے تھے۔ لیکن پھر کچھ حال نہ معلوم ہوا، کہ یہ شعبہ کہاں تک اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر رہا ہے۔" [1]

شذرات تمام ہو گئے۔

---

[1] معارف بابتہ جولائی ۱۹۲۱ء

چوتھا سفر حیدرآباد

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں علامہ مدراس تشریف لے گئے تھے۔ واپسی میں صرف احباب سے ملاقات کے لیئے مختصر قیام حیدرآباد میں بھی فرمایا۔ مگر اس سفر کی مختصر روداد الگ تحریر فرمائی جو معارف بابتہ نومبر، ۱۹۳ء میں "میرا مختصر سفر دکن" کے زیر عنوان چھپی ہے جو دلچسپ، تاریخی اور اہم افادی پہلو لیئے ہوئے ہے۔ ہم ذیل میں اس کو ضروری عنوانات و حواشی کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

میرا مختصر سفر دکن

اور اعلیحضرت خسرو دکن و برار کی بارگاہ میں میری باریابی اور سرفرازی

اور عطائے شاہی میں اضافہ

نجی سفر

اکتوبر کے آخر میں مجھے مدراس جانے کی ضرورت ہوئی۔ واپسی میں صرف دوستوں سے ملنے کی خاطر چند روز کے لیئے راستہ میں حیدرآباد ٹھہر گیا۔ حیدرآباد مجھے علمی اور قومی ضرورتوں کے سبب سے بارہا جانے کا اتفاق ہوا مگر میرا یہ سفر بالکل بے غرضانہ تھا۔ اعلیحضرت کی بارگاہ میں جہاں مجھے کئی دفعہ باریابی کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ اس دفعہ زمانہ قیام کے کم ہونے کے سبب سے باریابی کا خیال بھی نہ تھا۔

۲۹ کی صبح کو دوستوں نے مدراس میں الوداع کہا اور گاڑی دکن کی سمت روانہ ہوئی۔ ۳۰ اکتوبر کی صبح کو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچی۔ حسب معمول مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے یہاں قیام ہوا۔ اسی کی رات کو محب گرامی جناب ہوش بلگرامی کے یہاں جو میرے پرانے دوست ہیں کھانا تھا۔

اُن کے قلم میں جہاں ادبی نزاکتیں بھری ہیں۔ اُن کے دسترخوان میں لکھنو، رام پور اور دکن کی ساری نفاستیں یکجا تھیں

آصف سابع کی طرف سے غایت اکرام

اخباروں میں گو میرے آنے کی اطلاع چھپ گئی تھی مگر اعلحضرت کی بارگاہ میں معمول کے مطابق اپنی حاضری کا معروضہ نہیں گذارنا تھا، ورنہ اس کا خیال تھا، مگر وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ کا نقشہ دیکھئے کہ اعلحضرت نے اخباروں میں میرے آنے کی اطلاع ملاحظہ فرمائی تو از راہِ ذرہ نوازی ۲۵ شعبان المعظم کی رات کو ۸ بجے خاصہ مرحمت فرمایا[1] اور سہ شنبہ (۲۷ شعبان) کو ۱۱ بجے سعادت اندوزی کا حکم فرمایا۔ اس غیر متوقع سرفرازی سے مجھے اور میرے ساتھ میرے دوستوں کو بہت خوشی ہوئی۔ ۳۹ گھنٹوں کے انتظار کے بعد وہ وقت آیا جب میں کنگ کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے جاکر کھڑا ہوا۔ اعلحضرت کی سادگی اور سادہ پسندی کا حال معلوم تھا، اس لیئے ظاہری لباس اور پوشاک میں کسی قسم کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا، چوبدار نے اطلاع کی اور ٹھیک ۱۱ بجے یاد فرمایا گیا، پردہ کا بادل جیسے ہی ہٹا آصفی خاندان کا چاند سامنے نظر آیا[2] حسب معمول ایوان کے ایک چھوٹے سے برآمدہ میں جو ہر قسم کے ظاہری تکلف سے بے نیاز تھا۔ چھ کرور انسانوں کا حاکم نہایت ہی سادہ لباس[3] میں ایک کرسی پر جلوہ افروز تھا۔ سلام مسنون کے بعد سامنے کی دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ہوا۔

---

[1] یہ خاص الخاص قدر افزائی کی بات تھی کہ علامہ کی محض آمد کی اطلاع پاکر اعلحضرت کی طرف سے خاصہ ان کی قیام گاہ پر بھیجا گیا۔ [2] اعلحضرت کے دل میں جن علماء کی خاص عظمت تھی وہ ان کے لیئے پہلے خود باہر تشریف لاتے تھے [3] اعلحضرت کی سادگی پر علامہ کا یہ دلچسپ فقرہ کس قدر معنی خیز ہے کہ "اگر نظام کی سادگی مذہبی جذبہ کا نتیجہ ہوتی تو اس وصف میں وہ عمر ثانی ہوتے۔"

(حیات سلیمان ص ۶۷)

اعلحضرت سے طویل گفتگو اور باہمی تاثر

اعلحضرت نے گفتگو شروع فرمائی اور مسلمانوں کی مذہبی حالت اور مسلمان بچّوں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت اور اس سے مسلمان والدین کی بے پروائی پر نہایت دردمندانہ خیالات ظاہر فرماتے رہے۔ تقریر کا سلسلہ آج کل کے بعض باطل فرق اسلامیہ کی طرف منعطف ہوا، اور دیر تک ان کی گمراہی اور بے راہ روی پر افسوس فرماتے رہے پھر آج کل کے علماء اور مشائخ کی سستی، بے علمی اور طریق سلف سے انحراف پر تاسف فرمایا۔

خاکسار نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوتے ان باتوں کی مزید تشریح خدمت شاہی میں عرض کی، اور جا بجا موقع سے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے اپنے معروضہ کو موید کیا، اعلحضرت کی زبانِ مبارک سے بار بار تحسین و آفرین کے حوصلہ افزا الفاظ بلند ہوتے، اور نہایت بشاشت اور توجہ کے ساتھ میرے معروضات کو سماعت فرماتے رہے۔

میں جب کبھی کوئی آیت کریمہ یا حدیث شریف پیش کرتا۔ فوراً توجہ شاہانہ کے آثار روئے مطلعِ انوار پر جھلکنے لگتے اور ایک موقع پر جب میں نے وَمَن یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِن تَقْوَی الْقُلُوْبِ اور اس کی تشریح کی تو چہرۂ انور پر اثر کی ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور دوبارہ اس کو پڑھوایا، اسی طرح وَلٰکِن رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کی تشریح جب گذارش کی تو محظوظ ہوتے[1]

رمضان المبارک کی اہمیت، روزوں کی عظمت اور اس فرض کی طرف سے امراء کی غفلت پر تاسف ظاہر فرمایا، آخر میں میں نے اعلحضرت کی ان فارسی تحریروں کی طرف اشارہ کیا جو آج کل حیدرآباد کے اخباروں میں شائع ہوتی رہیں، تو ارشاد

---

[1] قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

فرمایا کہ میں تو سعدی و حافظ کی سادہ عبارت پسند کرتا ہوں، اور اسی کی پیروی کرتا ہوں، آج کل کی نئی فارسی پسند نہیں. خاکسار نے گذارش کی آج کل کی نئی فارسی تو فرانسیسی قالب میں ڈھلتی جا رہی ہے اور یورپین مفرس لفظوں کی بھنات سے ایک نئی زبان ہو رہی ہے. یہ بھی ارشاد ہوا کہ سیرۃ نبویؐ کبھی کبھی پڑھا کرتا ہوں. گفتگو کے بیچ بیچ میں بار بار یہ خیال میرے دل میں گذر رہا تھا کہ اس وقت ایک مملکت عظمیٰ کا سلطان وقت کس بے تکلفی سے ایک باریاب کو اپنی ہمکلامی کی عزّت بخش رہا ہے اور علم و فن کی قدردانی کا کیسا عملی ثبوت دے رہا ہے. اور یہی وہ مثالیں ہیں جن پر اسلام کی تاریخ کو ناز ہے۔

اعلیٰحضرت سے متعلق علامہ کا تاثر

مجھے اپنی زندگی میں کئی دفعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی فرمانرواؤں کی بارگاہوں میں باریابی کے موقعے ملتے رہے ہیں ان میں سب سے پہلے ہز ہائینس سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیۂ عالیہ بھوپال میں یہ مذہبی جوش اور ذات پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی دیکھی تھی اور یا اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن آصف سابع خلد اللہ ملکہ کے اندر وہ مذہبی عقیدت اور ذات قدسی صفات سرورِ کائنات علیہ الف تحیات کے ساتھ اور آپ کی ایک ایک چیز کے ساتھ وہ گہری عقیدت دیکھی جو کہیں نہیں دیکھی، جب کبھی اعلیٰحضرت اپنے آقا و مولیٰ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ فرماتے لب ولہجہ سے سننے والے کو محبت کی چاشنی معلوم ہوتی[1]

میں نے ایک موقع سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ایمان حضرت امام زین العابدینؓ کی محویتِ نماز اور حضرت سلطان المشائخ معین الدین اجمیریؒ

---

[1] افسوس کہ حیات کے آخری برسوں میں یہ کیفیت بدل گئی تھی۔

سلطان الاولیا نظام الدین دہلویؒ، اور حضرت سید محمد گیسو درازؒ رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور کفار و مشرکین میں ان کے اثر کے واقعات عرض کئے تو فرمایا کہ یہ تھے اللہ والے!

علامہ کی تحسین

ملاقات کا سلسلہ سوا گھنٹہ جاری رہا۔ ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر رخصت فرمایا اور ارشاد ہوا کہ "میں مل کر بہت محظوظ ہوا۔"

دائرۃ المعارف میں استقبالیہ

اسی دن کی شام کو میری واپسی کا وقت تھا، ساڑھے چار بجے دائرۃ المعارف کی اہمیت پر مختصر تقریر کی۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات نے جوابی تقریر کی، اور میرے اور دارالمصنفین کی حقیر خدمات کو بیحد سراہا۔

مہاراجہ کشن پرشاد سے ملاقات

نماز کے بعد سر مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر سے ملنے کے لیے ان کی جاگیر مین الوال گیا۔ جو حیدر آباد سے باہر ۱۲ میل پر ہے مولانا عبدالباری، مولانا مناظر احسن اور حکیم الشعراء امجد ساتھ تھے۔ سر مہاراجہ نے اپنی شرافت طبع اور وضع کی پابندی کی بناء پر جس کی خاندانی امراء میں وہ آخری مثال ہیں، تا لب فرش پیشوائی فرمائی۔ وہاں سے واپسی پر دیر ہو جانے کے سبب سکندر آباد میں ریل میں سوار ہوا اور دو رات اور ایک دن تک وہی خواب دیکھتا رہا جو دکن کی سرزمین کے اس مختصر قیام کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ ۳۰ رشعبان المعظم کو اعظم گڑھ پہنچا اور بدستور اپنے کاموں میں

لے تفصیل کا موقع نہیں۔ حضرت آصف جاہ اول کو حضرت محبوب الٰہی سے خاص نسبت روحانی حاصل تھی۔ دکن کی خود مختاری سے قبل انھوں نے کچھ عرصہ درگاہ محبوب الٰہی میں خلوت گزینی اختیار کی تھی اور پھر اشارہ پاکر خود مختار سلطنت کے قیام کا عزم کیا تھا لہ اسی آبائی تعلق کی بناء پر اعلیٰحضرت کو سلسلہ چشتیہ کے ان مشہور بزرگ سے بڑی عقیدت تھی، اور جب ان کا رجحان امامیہ مسلک کی طرف نہ ہوا تھا ہر سال گلبرگہ حضرت گیسو دراز کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔

مصروف ہوگیا۔

دستِ خاص کا تحریری فرمان اعظم گڑھ میں

رمضان المبارک کی تیسری تاریخ تھی کہ ڈاک کے ہرکارہ نے ایک زرد[1] رجسٹری ہاتھ میں لاکر دی، کھولنے کے ساتھ آنکھیں کھل گئیں کہ یہ اعلحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے دستِ خاص سے لکھا ہوا فرمان تھا۔ جس میں دار المصنفین کے سابقہ تین سو ماہوار کے وظیفہ کے ساتھ تین سو روپیہ ماہوار کے مزید اضافہ کا حکم تھا اور سیرۃ کی تکمیل کے بعد ایک شاہی صلہ کی بشارت تھی۔ آفتابِ جلالت کی اس ذرہ نوازی سے آنکھیں پُر نور ہوئیں اور دل مفتخر اور مسرور اس فرمانِ مبارک میں ذاتِ قدسی صفات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسنِ ادب کی ایک مثال یہ ہے کہ لفظ "سیرۃ نبوی" کو بھی سطر سے اُوپر کرکے لکھا گیا ہے، تاکہ حسبِ آدابِ سلاطین تیموری ظاہر باطن کا آئینہ ہو۔ یہ فرمان دار المصنفین کے تاریخی نوادر میں شامل ہوگا اور آئندہ نسلوں کو شاہانِ اسلام کی علم نوازی کا نمونہ دکھاتا رہے گا۔

علامہ کی طرف سے تشکر

یہ شاہانہ امداد و سرپرستی جو دستِ غیب سے ہماری قسمت میں آئی ہمارے لیے سعادت کا سرمایہ اور عزت کی دستاویز ہے! علم وفن کی یہ قدر شناسی اور علم وفن کے خدمت گذاروں پر شاہانہ نوازش آج ساری دنیا میں صرف خانوادۂ آصفی کی تاریخ پیش کرسکتی ہے، دُعا ہے کہ اللہ عز وجل اس کو علم وفن اور دین وملت کی سرپرستی

---

[1] زرد رنگ اعلحضرت کی دستار، مملکت آصفیہ کے علم، اعلحضرت کے ٹرین کے ڈبوں اور ان کی ہر شخصی چیز کے لیے مخصوص تھا، مشہور و متواتر روایت یہی ہے کہ جب آصف جاہ اوّل حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کی بارگاہ سے رخصت ہونے لگے تو اس وقت کے سجادہ نشین نے، اُن کے سر پر زرد رنگ کا صافہ باندھا اور زرد ہی رنگ کا ایک کپڑا گلے میں ڈالا تھا، اسی لیے تاج اور علم کا رنگ زرد رکھا گیا۔

کے لیے ہمیشہ قائم رکھے اور اس کے آفتاب کا اقبال ہمیشہ یونہی چمکتا رہے ۔

تا جہاں باشد و این گنبدِ گرداں باشد
دہر فرمانبرِ عثمان علی خاں باشد[1]

---

[1] یہ شعر علامہ نے خود فی البدیہہ موزوں فرما دیا تھا

مجلس احیاءِ معارف النعمانیہ

فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب (بانیٔ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن) کے لائق و قابل فخر تلامذہ میں سے ایک مولانا ابو الفا ر قندھاری ثم حیدرآبادی تھے، مزاج تحقیقی پایا تھا، امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کی فقہ سے ان کو خاص شغف تھا۔ انھوں نے شہر حیدرآباد میں "مجلس احیاءِ معارف النعمانیہ" کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی، اور بڑی تحقیق و کاوش سے فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں مقابلہ تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیں، اور علمی دنیا میں اس ادارہ نے ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔ مولانا ابو الفاء نے مولانا شبلی نعمانی سے بھی تحقیقی کاموں میں رہبری حاصل کی تھی اور استفادہ کیا تھا، اسی جہت سے ان کا تعلق علامہ سید سلیمان ندوی سے بھی رہا، غالباً ۱۹۵۱ء میں مولانا کراچی تشریف لائے تھے۔ ایک شام علامہ کی خدمت میں بھی آئے، راقم الحروف اس وقت وہاں موجود تھا۔ مولانا ابو الفا جس مسرت، محبت اور ادب سے علامہ سے ملے ہیں، وہ تصویر آج بھی پردۂ ذہن پر نازہ ہے۔ جب وہ تشریف لے گئے تو علامہ نے مجھ سے دریافت فرمایا "آپ انھیں پہچانتے ہیں؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں یہ ابو حنیفہ کے بیٹے تھے"[1] میرے اس جواب پر علامہ ہنسے اور فرمایا کہ آپ توخوب واقف ہیں، بہرکیف مولانا اور ان کے ادارہ سے متعلق علامہ کا اعتراف اور داد تحسین درج ذیل شذرہ سے بخوبی ہو جائے گی۔

---

[1] مولانا ابو الفار کے بے تکلف احباب علماء انھیں اسی نام سے پکارتے تھے اور مولانا بھی محظوظ ہوتے تھے

"مجلس احیاء معارف النعمانیہ حیدرآباد دکن جو فقہ حنفی کی امہات کتب کو چھاپنے کا کام بڑی محنت سے انجام دے رہی ہے ابھی حال میں اس نے امام محمد کی مشہور کتاب جامع کبیر کو چھاپ کر شائع کیا ہے۔ کتاب کے مسودہ و مصحح مولانا ابو الوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسۂ نظامیہ نے جس طرح ٹونک جاکر ستائیس دنوں میں اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا اور مصر و قسطنطنیہ سے اس کے عکسی نسخے منگوا کر مقابلہ اور تصحیح و تحشیہ کی خدمت انجام دی وہ علمائے سلف کی محنتوں کو یاد دلاتی ہے۔"[۱]

اختلافِ ائمہ اربع کے بارے میں اعلحضرت کا علامہ سے تحریری استفسار اور علاّمہ کا بصیرت افروز جواب

اعلحضرت آصفِ سابع علاّمہ کی فضیلتِ علمی کے حد درجہ قائل ہو گئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے علمی اشکالات کا حل علامہ سے حاصل کرنے لگے تھے، ذیل میں اعلحضرت کا ایک مکتوب اور اس کا جواب جو معارف بابتہ اگست ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے پیش ہے، غور سے ملاحظہ ہو کہ مستفسر ایک والیٔ مملکت ہی نہیں سلطان العلوم ہے اور جواب دہ اپنے عصر کا ابن قیمؒ! جواب بلا رد و رعایت ہے مگر پیرایہ حکیمانہ اور مصلحانہ :۔

---

[۱] ماہنامہ معارف۔ اگست ۱۹۳۸ء شذرہ (۶)

نامۂ خسروی

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف سابع دام اللہ ملکہٗ

۱۰ ربیع الثانی ۵۸ھ

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی

چونکہ بدو شعور سے میری طبیعت کا رنگ ایسا واقع ہوا ہے کہ جب تک مذہبی مسائل ہوں یا دینی امور ہوں، بعد تحقیق و تفتیش کوئی خاطر خواہ معقول وجوہ یا اسباب اس کے پائے نہ جائیں، اس کے قبول کرنے میں قلب کو پس و پیش رہتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ ائمہ اربعہ فقہاء کے فتوے جو کچھ ہیں گو یہ سب اصول میں مذہب اسلام کے متفق ہیں آپس میں، تاہم فروعات میں ہر ایک کا اجتہاد جدا نوعیت کا واقع ہوا ہے، یعنی اس میں بھی ہم فریق ہیں یعنی احناف، شوافع، مالکی، حنبلی، اور صرف نماز کی ادائی کو ہی لیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ نمبر اول کے ہاں نیت صلوٰۃ کے بعد ہاتھ ناف کے نیچے باندھنا، نمبر دوم کے ہاں سینہ پر باندھنا اور رکوع میں رفع یدین کرنا، نمبر سوم کے ہاں ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا، اور نمبر چہارم کے ہاں شاید پیروی کرنا ہے مخلوط نمبر ۲ و نمبر ۳ کی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے نبیؐ برحق نے بعض دفعہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہے اور بعض دفعہ ہاتھ چھوڑ کر بھی، لہٰذا دونوں طریقے درست ہیں، وغیرہ اور بعض احناف کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (مسجد میں)، رکوع میں رفع یدین کرتے ہوتے جب کہ ان کے امام کے ہاں اس کی ضرورت نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

پس اس خلجان اور مشترکہ حالات میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس امام کے

فتویٰ کی پیروی کی جائے، اور کس کا اجتہاد قوی ہے (ان مسائل میں)، اور کس کا قوی نہیں ہے، حالانکہ شریعت اسلام میں ان چاروں ائمہ کے فتوے چالو ہیں، اور ہر ایک کو دوسرے پر برتری نہیں دی جاتی ہے بلکہ اپنی اپنی جگہ سب کو درست سمجھا جاتا ہے، اور جب یہ کلیہ تسلیم کرلیا جائے گا، تو ہر امام کی پیروی کرنے والا گروہ برجادۂ حق سمجھا جائے گا۔

الحاصل میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس بارہ میں مولوی صاحب کا کیا خیال ہے اور اگر آئندہ کوئی موقع ہمدست ہوا تو اس وقت تفصیل سے ان امور پر بالمشافہ گفتگو بھی کروں گا مگر سردست اسی پر اکتفا کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے نزدیک انسان جس طرح سے چاہے خدا کی عبادت کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو جس کو کہ اس کے مذہب نے بتایا ہو (یعنی اس کے خلاف کوئی دوسرا طریقہ نہ ہو) درال حالیکہ اس سے بحث نہیں کہ ان ارکان میں اگر خفیف ترمیم پائی جائے، یا نوعیتِ شان بدلی ہوئی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

زیادہ اُمید ہے کہ مزاج رو بصحت ہوگا۔

آصف سابع

نامۂ خسروی
اور
اختلافات طریقہ نماز

آج جب کہ امرا اپنے عیش خانوں میں یادِ خدا سے غافل ہیں، اور ابنائے عصر زمانہ کے مہلک اثرات سے متاثر ہو کر نماز جیسی چیز سے جس پر اسلام کی ساری عمارت کی بنیاد ہے، بے پروا ہیں کیا یہ حیرت انگیز بات نہ ہوگی، کہ ایک سلطان وقت عیش خانہ کی آب و ہوا سے نا آشنا، اور زمانہ کے اثرات سے بے پروا ہو کر یادِ خدا کو اپنی زندگی کا فریضہ، اور نماز کو اپنی زندگی کا دستور بنائے ہے، اور اس کی حیثیت صرف تقلیدی نہیں بلکہ علم و نظر اور تحقیق و کاوش سے اس کے اصول، و فروع کی تفتیش کا ذوق رکھتا ہے۔

اعلیٰ حضرت ادام اللہ ملکہ نے جس بحث کو چھیڑا ہے۔ وہ حقیقت میں تحقیق کے قابل ہے اور جس نوع سے اختلافات کی تطبیق کا اشارہ فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، یعنی "وہ ایسا طریقہ ہو جس کو اس کے مذہب نے بتایا ہو"، اس لئے ہر وہ شئے جو شارع کے حکم اور رسولؐ کی سنت سے ثابت نہ ہو وہ صحیح نہیں، اور وہ تمام طریقے جو رسولؐ کی سنت سے ثابت ہوں، اور وہ سب صحیح ہوں، ان میں سے ہر طریقہ امت کے لیئے قابلِ اختیار ہے، اور اگر ان میں سے کوئی طریقہ مقابلتاً زیادہ صحیح طریقہ سے ثابت ہو، تو وہ مستحب تر، اور دوسرے طریقے بحدِ جواز رہیں گے،

اصل نماز قیام و قعود و رکوع سجود اور قرآت کا نام ہے۔ اس میں تمام فقہاء اور مجتہدین متفق ہیں، اختلاف فروعی باتوں میں ہے۔ ان فروعی باتوں میں سے ہر بات کسی نہ کسی روایت میں آئی ہے، اس لیئے جو جس روایت کو زیادہ صحیح سمجھتا

ہے، اس پر عمل کرتا ہے۔

لیکن ان فروعیات میں ایک بات ایسی ہے، جو کسی روایت اور رسول علیہ السلام کے کسی عمل سے ثابت نہیں' اور وہ بات قیام میں ہاتھوں کو چھوڑ کر (ارسال) نماز پڑھنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مالکیہ کا عمل اسی پر ہے، مگر کوئی معمولی سے معمولی روایت ان کے پاس ان کے اس عمل کی تائید میں نہیں ہے، بلکہ اس کے مجتہد وامام حضرت امام مالک کی کتاب موطا میں بھی ہاتھ باندھ کر (وضع ید) ہی نماز پڑھنے کی روایت ہے (ص۵۵) نیز ان کی سب سے مستند فقہ کی کتاب مدونہ میں بھی ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے (ص ۷۶، ج ۱) کہتے ہیں کہ عباسیہ کے زمانہ میں امام ممدوح کو ایک فتوی کی بنا پر جو حکام سلطنت کی مرضی کے مطابق نہ تھا، کوڑے مارے گئے تھے، جس سے ان کا شانہ اتر گیا تھا، اور وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر نہیں رکھ سکتے تھے، ان کے پیروؤں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ ان کے نزدیک نماز میں ہاتھ باندھنا نہیں بلکہ چھوڑنا ہے۔

یہ تاویل کہیں نواب صدیق حسن خاں کی کتابوں میں نظر سے گذری تھی، مگر مدونہ کے دیکھنے سے جو امام مالک کے خاص شاگرد کی تصنیف ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ امام مالک واقعی ہاتھ باندھنے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

وقال مالك فى وضع اليمنى على اليسرى فى الصلاة قال لا اعرف ذلك فى الفريضة وكان يكرهه ولكن فى النوافل اذا طال القيام فلا باس بذلك يعين به نفسه (ص۷۶ جلد ۱ مصر)	مالک نے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر نماز میں رکھنے کی نسبت کہا کہ میں اس کو فرض نماز میں نہیں جانتا، اور وہ اس کو ناپسند کرتے تھے، لیکن نفل نمازوں میں جب قیام لمبا ہو تو کچھ ہرج نہیں کہ اس سے سہارا لے۔

مگر امام کے دوسرے شاگردوں نے جمہور کے مطابق امام سے ہاتھ باندھنے ہی کی روایت کی ہے، اور امام نے خود ہی اپنی تصنیف موطا میں یہ دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک یہ کہ تین باتیں شریعتوں کے متفقہ امور میں سے ہیں، جن میں سے ایک نماز میں ہاتھ باندھنا ہے اس کے بعد امام مالک اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے، دوسری روایت امام نے یہ نقل کی ہے "لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا، (یعنی رسول اللہ صلعم حکم دیتے تھے) کہ نماز میں داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں"، راوی کہتا ہے کہ اس واقعہ کی نسبت رسول اللہ صلعم کی طرف ہے،

(موطا امام مالک باب وضع الیدین احدٰ ھما علی الاخریٰ)

پہلی حدیث کی شرح میں مالکی محدث زرقانی نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اشہب نے مالک سے نقل کیا کہ نفل اور فرض نمازوں میں ہاتھ باندھنے میں مضائقہ نہیں، مالک کے مدنی شاگردوں نے یہی کہا ہے اور مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے کہ مالک نے اس کو اچھا سمجھا ہے، حافظ ابن عبد البر (مالکی) کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم سے ہاتھ باندھنے کے سوا کوئی اور دوسری روایت نہیں آئی ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور یہی جمہور صحابہ اور تابعین کا مسلک ہے، اور اسی کو مالک نے موطا میں ذکر کیا ہے، اور مالک کے شاگردوں میں سے ابن منذر وغیرہ نے اس کے سوا دوسری بات مالک سے نقل نہیں کی ہے، البتہ مالک کے شاگرد ابن قاسم نے مالک سے ہاتھ چھوڑنا نقل کیا ہے اور اکثر مالکیوں نے قبول کیا ہے۔ (ص۲۶۸ مصر) باجی مالکی نے بھی شرح موطا میں ایسا ہی لکھا ہے (ص۲۸۱ مصر)

بہر حال ہاتھ چھوڑنے کی نسبت امام کی رائے اگر ہو بھی تو اس رائے کو

خود ان کے بڑے بڑے شاگردوں نے صحیح روایات کی بنا پر رد کر دیا، چنانچہ مدوّنہ میں اس کے بعد ہی ہے۔

قال سحنون عن ابن وهب
عن سفیان الثوری
عن غیر واحدٍ من
اصحاب رسول اللہ صلعم
انهم رأوا رسول اللہ
صلعم واضعًا یده الیمنیٰ
علی الیسری فی الصلوٰة۔
(ص ۷، جلد ۱ مصر)

سحنون نے کہا ابن وہب سے
روایت ہے، اور وہ سفیان ثوری
سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں
نے بہت سے اصحاب رسول صلعم
سے سُنا ہے کہ انھوں نے
رسول اللہ صلعم کو نماز میں دیکھا
کہ وہ داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ
پر رکھے تھے۔

غرض کسی مجتہد کی ایسی رائے جو رسولِ اکرم صلعم سے ثابت یا آپ کے کسی قول و عمل سے مستنبط نہیں، قابلِ حجت نہیں۔ باقی تمام اختلافات فروعی ہیں، جو صحتِ نماز میں قادح نہیں!

نامۂ خسروی کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے:۔

"دراں حالیکہ اس سے بحث نہیں کہ ان ارکان میں اگر خفیف ترمیم پائی جائے یا نوعیت شان بدلی ہوئی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے"

اس فقرہ کا ظاہری مطلب خود اعلیٰ حضرت کے سابق کے اس ارشادِ گرامی کے خلاف ہے:۔

بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو، جس کو کہ اس کے مذہب نے بتایا ہو (یعنی اس کے خلاف کوئی دوسرا طریقہ نہ ہو)

مقصد یہ ہے کہ عبادات تمام تر وحی کی تعلیم سے ہیں۔ اس تعلیم میں کسی انسانی رائے سے خفیف سی خفیف ترمیم یا نوعیت شان کی تبدیلی جائز نہیں، یہ خالقِ فطرت ہی

کو معلوم ہے۔ اور اسی نے انبیاء کو وحی سے بتایا اور انھوں نے ہم کو سکھایا، کہ ہم کس طرح اُس کی عبادت کریں۔

مگر اعلیٰ حضرت کے اس آخری ارشاد سے کہ

"آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے نزدیک انسان جس طرح سے چاہے خدا کی عبادت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا طریقہ ایسا ہو جس کو اس کے مذہب نے بتایا ہو"

یہ ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت کا یہ منشا نہیں کہ ہر انسان کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے وہ اپنے خدا کی عبادت کرے، کیونکہ اعلیٰ حضرت نے شرط لگا دی ہے، بشرطیکہ وہ طریقے اس کے مذہب نے بتاتے ہوں، اس لیے اعلیٰ حضرت کے اس عموم کا مقصد یہ ہے کہ مذہب اور صاحب مذہب سے جو طریقے مروی ہیں، ان میں سے کسی ایک طریق کو جو چاہے اختیار کرے۔ اس پر تقیید نہیں ہے کہ کسی ایک طریق ہی کو جائز اور دوسرے کو تمام تر ناجائز سمجھا جائے،

اعلیٰ حضرت کے اسی منشاء کی تائید اعلیٰ حضرت کے کلام سابق سے ہوتی ہے،

"بلکہ اپنی اپنی جگہ پر سب کو درست سمجھا جاتا ہے، اور جب یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے گا تو ہر امام کی پیروی کرنے والا گروہ برجادۂ حق سمجھا جائے گا"

اَب رہی یہ بات کہ

"کس امام کے فتوٰی کی پیروی کی جائے، اور کس کا اجتہاد قوی ہے (ان مسائل میں) اور کس کا قوی نہیں"

تو اس کا حل یہ ہے کہ جو فتوٰی کلام الٰہی اور ارشادِ رسالت پناہی کے عین مطابق ہو، وہی قوی اور صحیح ہے، اور اگر احتمال تعدد کا ہے، یا محض

رائے واستنباط کا دخل ہے، توجو احتمال اور رائے واستنباط کلام الٰہی اور ارشاد رسول کریم علیہ السلام سے قریب تر ہو، وہی قوی ہوگا اور اگر ان میں دلائل کا تعارض ہے، اور ہر ایک کی دلیل اپنی جگہ پر صحیح معلوم ہوتی ہے، توجس کو جو بات صحیح معلوم ہو، اسی پر وہ عمل پیرا ہو، مگر اس کو چاہیئے کہ وہ دوسرے کو بر سر غلط نہ کہے، کیونکہ یہ ایسے اختلافات ہیں، جن سے دین کیا دنیا کے معاملات بھی خالی نہیں، ججوں کے بہترین دماغ، وکلاء کی بہترین قابلیتیں، اور قانون کے دفعات کی ہر لحاظ سے محتاط عبارتیں بھی انسانی فطرت کے اس اختلاف کو اب تک نہ مٹا سکی ہیں، نہ مٹا سکیں گی۔

سُنیت اور شیعیت کے درمیان راہِ اشتراک سے متعلق خسروِ دکن کا استصواب اور علّامہ کا جواب

سنہ و تاریخ افسوس کہ میں نے دریافت نہیں کی البتہ راست علّامہ سے یہ واقعہ میں نے سُنا اور یہیں قیام کراچی کے دوران سُنا کہ ایک مرتبہ اعلحضرت خسرو دکن کا نامہ مبارک موصول ہوا، وہ اور اس کا جواب ایسا نہیں تھا کہ شائع کیا جاتا، اس کی تفصیل سننے سے پہلے قارئین اس مراسلت کے پس منظر کو سمجھ لیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے کہ اب اعلحضرت سنیت سے منحرف ہو کر شیعیت پر مفتون ہو چکے تھے، خادم حرمین شریفین کہلوانے پر فخر کرنے والے نے اپنے حبیب خاص سے عزا خانۂ زہراء کی تعمیر کروا لی تھی۔ نعت گوئی کا ولولہ رخصت ہو چکا تھا اور اب روزنامۂ نظام گزٹ اور دوسرے جرائد میں اہلِ بیت کرام رضا کی منقبتیں (بزنگ تشیع) اور مراثی چھپنے لگے تھے، ماہِ محرم میں ان کی عزاداری اور علم پرستی منظر عام پر آچکی تھی، مگر دستوری مجبوری یا کسی اور مصلحت سے انھوں نے اپنے مسلک کی تبدیلی کا اعلان نہیں فرمایا تھا، شہر کے سُنّی علماء کے سامنے ایک مرتبہ اپنے "تفضیلی" ہونے کا اظہار کیا تھا جس پر بعضے علماء نے بروقت اور بالمشافہ ان کے اس خیال کی تردید کر دی تھی ـــــ اب ان کو یہ سوجھا کہ سنیت اور شیعیت کے درمیان کوئی راہِ اشتراک ایسی نکالی جائے کہ یہ جھگڑا ابھی ختم ہو اور ان کے اختیار کردہ مسلک کو اس میں تحفظ مل جائے۔

اس کے لیئے ان کی نظر پھر علامہ سیّد سلیمان ندوی پر ہی پڑ گئی۔ ایک "نامہ خسروی" کے ذریعہ علامہ کو لکھا کہ میری رائے میں سُنّی، شیعہ اختلافات کو ختم کرنے کے لیئے سنیت اور شیعیت کے درمیان ایک ایسی راہ اشتراک نکالنی چاہیئے جس میں دونوں مسلکوں میں مصالحت پیدا ہو جائے۔

علامہ کے لیئے اب موقع حنبلی جرأتِ اظہار کا تھا۔ انھوں نے اعلحضرت کے سارے اکرام اور محسنانہ برتاؤ کے پاس ولحاظ کے باوصف نیز خود اپنی نرم مزاجی و شیریں دہنی کے باوجود، بغیر اس کی پروا کیئے کہ ان کا شخصی وظیفہ اور دارالمصنفین وندوہ کی امدادیں جاری رہیں گی یا بند ہو جائیں گی، آصف جاہِ سابع کو یہ دوٹوک جواب لکھ بھیجا کہ:

"یہ سودا پہلے بھی بعض لوگوں کے سر میں سمایا ہے مگر حق اور باطل کے درمیان کوئی راہِ اشتراک نکالی نہیں جا سکتی"۔

اس بے لاگ جواب کو پاکر اعلحضرت چُپ ہو گئے، اور داد دینی پڑتی ہے ان کی عالی ظرفی کی کہ اس شخصی مسئلہ کو انھوں نے اپنی ذات ہی تک رہنے دیا۔ اور ضرورت پڑنے پر ندوہ کی امدادیں دوگنا اضافہ کر دیا[1]۔ اور آخر وقت تک علامہ کے قدرشناس رہے۔

---

[1] محترم مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی نے نظام کی وفات پر یہ فرمایا تھا کہ مسلم سلاطین کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی کہ سلطنت ختم ہو گئی ہو اور بادشاہ کے جاری کردہ وظائف پھر بھی جاری رہے ہوں، مگر نظامِ دکن کو دیکھا گیا کہ سقوط حیدرآباد کے بعد بھی دینی اداروں کے وظائف "صرفِ خاص" کی آمدنی سے اُن کی زندگی بھر جاری رہے۔

طلبائے جامعہ عثمانیہ کے نام پیام

انجمن طلبائے اتحادِ جامعہ عثمانیہ کا ایک سہ ماہی مجلّہ، مجلّہ عثمانیہ کے نام سے نکلتا تھا، ظاہری اور معنوی اعتبار سے معیاری و مثالی، اس کی ایک خصوصی اشاعت ایڈیٹر نمبر کے عنوان سے شائع ہونے والی تھی، اس کے لیئے جہاں اور اکابر ہند سے پیامات حاصل کئے گئے، علامہ سے بھی ایک پیام حاصل کیا گیا، یہ پیام اپنے ایجاز طرز اور تعبیر کے اعتبار سے اعجازِ سلیمانی ہے، اس سے علامہ کی اس قلبی مسرت کا اظہار ہوتا ہے جو زبانِ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے کامیاب تجربہ کی وجہ سے اُن کو حاصل تھی، نیز اس پیام کی بلاغت میں آج پاکستان کے مذبذب ماہرین تعلیم کے لیئے سامانِ عبرت بھی ہے، علامہ کا پیام یہ ہے:-

"عثمانی نوجوانانِ دکن!

عثمانی نوجوان ہمارے ملک کی شصت سالہ تعلیمی خواب کی تعبیر ہیں، انھوں نے اپنی مادری زبان میں تعلیم پاکر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے، اس لیئے ان کی دماغی وجسمانی صحت، طاقت اور قوت کا پورا یقین ہے اور چند ہی برسوں کے تجربہ میں ثابت ہوگیا ہے کہ ہمارے تعلیمی طبیبوں کا خیال ہر طرح درست ثابت ہوا۔"[1]

---

[1] سرگزشت جامعہ عثمانیہ مولفہ بدر شکیب ص ۸۹ بحوالہ مجلس عثمانیہ۔ ایڈیٹر نمبر

آموں کا شاہی تحفہ اور علّامہ کے قطعات

ارمغان سلیمان جو علامہ کی قلمی بیاض کی نقل ہے۔ اس میں علّامہ کے دو قطعات ہیں کے نیچے" در آخر جولائی ۱۹۳۸ء" لکھا ہے۔[1] جولائی ۱۹۳۸ء میں علامہ کے سفر حیدر آباد کی کوئی روداد معارف میں ملتی ہے نہ حیات سلیمان میں، یا تو آموں کا یہ تحفہ خسروانہ اعظم گڈھ بھیجا گیا ہے یا یہاں تاریخ کا کچھ سہو ہے اور کسی قیام حیدر آباد ہی کے دوران "بہ مراحم خسروانہ" یہ تحفہ حیدر آباد ہی میں موصول ہوا ہے۔

بہر صورت وہ قطعات مع سلیمانی عنوان کے درج ذیل ہیں، قادر الکلامی ملاحظہ ہو۔

"اعلحضرت سرکارِ نظام تحفہ آنبہ فرستادند، لب بہ شکر کشودم

دانہ آنبہ مرا شاہ بدامن انداخت
آسماں، قدرِ زمیں را یہ ثریا افراخت
شاہ از باغِ جہاں چوں برِ شیریں برچید
لذتش دورِ زمانہ بمر اوش درساخت

التفات وکرمِ خاص چو فرمود بہ من
تحفہ انبہ فرستاد مرا شاہِ زمن
جز دعا پیش گدا، پیش کشِ شایان نیست
انبتہ اللہ نباتاً حسناً ارض دکن

در آخر جولائی ۱۹۳۸ء

---

[1] ارمغان سلیمان ص ۱۰۲

پانچواں سفر حیدرآباد

مذکورہ سفر کے ڈیڑھ برس بعد علامہ کا پھر حیدرآباد آنا ہوا، قیام مختصر ہی رہا، مگر حیدرآباد ترقیات خصوصاً علمی میدان میں اس قدر رواں دواں تھا کہ علامہ نے ماضی قریب اور حال میں بین فرق محسوس کیا، اسی لیئے مارچ ۱۹۴۰ء کے معارف میں حیدرآباد پر پھر تفصیلی تاثرات رقم فرماتے، ملاحظہ ہوں :۔

ہر سال ترقی کا ایک پورا دور ہے

۲۵ جنوری ۴۰ء سے ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء تک

پورا ایک مہینہ لکھنو حیدرآباد دکن، پونہ اور بمبئی کے سفر میں گذرا، حیدرآباد اس دفعہ گو ڈیڑھ ہی برس کے بعد جانے کا اتفاق ہوا، مگر اس ڈیڑھ ہی برس میں حیدرآباد کی علمی و ادبی و تعلیمی ترقیوں میں غیر معمولی اضافہ پایا، اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اعلحضرت سلطان العلوم کے عہد حکومت کا ہر سال علمی و ادبی ترقیوں کا ایک پورا دور ہوتا ہے۔

آرٹس کالج کی پرشکوہ عمارت

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں سب سے پہلی ملاحظہ طلب چیز جامعہ عثمانیہ کا کلیہ فنون (آرٹس کالج) ہے، یہ پہاڑ سی مضبوط اور پھول جیسی خوبصورت عمارت تیشۂ کوہکن اور حسن شیریں دونوں کی ایک ساتھ تصویر ہے۔ عمارت کے[1]

---

[1] اس کی نچلی منزل غار ہائے ایلورا کے فن تعمیر کی عکاسی کرتی ہے اور بالائی منزل مغلیہ فن تعمیر کا آئینہ ہے، دیکھنے کی چیز دونوں فن کا حسین امتزاج ہے۔ یہ اپج اور انفرادیت کا قیام آزاد حیدرآبادیوں کی ذہنی خصوصیت تھی، جس سے افسوس کہ آزاد پاکستان تک محروم ہے، ضرورت ہے کہ وہ تاریخ حیدرآباد سے اس کا درس لے۔

نیچے کا حصہ طالب علموں کے اجتماعات کے لئے ہے اور اوپر کی منزلیں تعلیم کی ہیں۔ مشرقیات اور شعبۂ دینیات کے شعبے ایک طرف ہیں۔ دوسری طرف سنسکرت تامل، تلنگو، کنڑی وغیرہ زبانوں کے کمرے ہیں، دوسرے علوم کے کمرے بھی پہلو بہ پہلو ہیں، ایک پوری منزل کتب خانہ کی ہے جو تین طرز پر طبقہ بہ طبقہ لوہے کی الماریوں اور ستونوں پر قائم ہے ہمارے دار العلوم ندوۃ کے ایک تعلیم یافتہ گریجوایٹ ہیں۔

سیتاپھل منڈی کی مسجدِ اقصیٰ

جامعہ عثمانیہ کے دائرہ کے قریب[1] ہی ایک نیک دل مسلمان نے بڑی محنت سے ایک مسجد بنائی ہے، اسی مسجد کے گرد ہمارے دوستوں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی قیام گاہیں ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب تو گویا مسجد کے حجروں ہی میں قیام پذیر ہیں۔

زاہد فلسفی مولانا عبدالباری ندویؒ

ایک فلسفی کو مسجد میں قیام پذیر دیکھ کر دین و دنیا کے اجتماع کا وہ اگلا سا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس کی نسبت عربی شاعر نے کہا ہے،

ما احسن الدّین والدنیا اذا اجتمعا

درویش عالم مولانا گیلانیؒ

درویش عالم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کالج کے درس کے بعد مسجد میں چند خوش نصیبوں کو قرآن پاک کا درس اور سکندرآباد کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں، موصوف کی آواز اور بیان میں تاثیر کا دریا موجیں مارتا ہے۔ وہ تقریر نہیں کرتے اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرتے ہیں، اور یہ آواز دیتے ہیں۔

من قماش فروش دل صد پارۂ خویشم

---

[1] اس محلہ کا نام "سیتا پھل منڈی" تھا۔

شفاخانۂ یونانی اور نظامیہ کالج

شہر کے اندر اس سال کی نئی ترقیوں میں صدر شفاخانۂ طبیہ اور نظامیہ طبیہ کالج ہے، جو شہر کے مشہور مرکزی مقام چار مینار کے پیچھے واقع ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے تمام شعبوں کو اور اس کے اہتمام و انتظام کی خوبیوں کو دیکھ کر ششدر ہو گیا۔ اس کے ناظم مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے لائق شاگرد حکیم مقصود علی خاں[1] ہیں اور دوسرے اطبا اور اساتذہ بھی زیادہ تر مسیح الملک مرحوم ہی کے تلامذہ اور ان کے خاندان کے مستفیدین میں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کسی ستارہ شناس نے آسمانِ طب کے سارے منتشر ستاروں کو ایک مرکز پر جمع کر لیا ہے۔

اس شفاخانہ اور طبیہ کالج کی اہمیت و عظمت کو سمجھنے کے لیئے اتنا کافی ہے کہ کسی میڈیکل کالج کو اپنے سارے اہتمام و انتظام اور وسعت کے ساتھ صرف اتنے فرق کے ساتھ تصور کر لیجیے کہ ڈاکٹروں کی جگہ اطبا ہیں اور انگریزی دواؤں کی جگہ طبی دوائیں اور علاج کے طریقے ہیں، ہر چیز نہایت صاف ستھری، عمارت نہایت بلند اور خوبصورت، دوائیں، دواؤں کے بنانے کے کمرے، مریضوں کے کمرے، پڑھائی کے کمرے، ہر چیز سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ نظر آئی۔

اساتذہ کے لکچر سنے، ان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھا، کتب خانہ دیکھا، تعلیمی شعبوں میں ایک نیا شعبہ تاریخ طب کا بھی تھا، جس میں تاریخی تحقیقات سے بتایا جاتا ہے کہ بہت سی وہ باتیں جو نئی سمجھی جاتی ہیں وہ ہماری قدیم طب کے گوشوں میں بھی پڑی ہوتی ہیں، غرض قدیم و جدید کی وہ خوشگوار آمیزش یہاں نظر آئی جو مرحوم حکیم اجمل خاں کی طبی زندگی کی انتہائی خواہش تھی[2]۔ اس کو دیکھ کر یہ جی چاہا کہ جس

---

[1] الخاطب بہ مقصود جنگ، اعلیٰحضرت کے طبیب خاص و مصاحب۔ [2] علامہ کو خود بھی طب سے بڑی دلچسپی تھی اور یہ ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا، حیات شبلی میں علامہ نے مولانا شبلی نعمانی کے شخصی احسانات کا جہاں تذکرہ کیا ہے، وہیں لکھا ہے کہ مولانا نے انھیں مسند تصنیف تالیف پر نہ بٹھایا ہوتا تو وہ اپنی موروثی مسند طبابت سنبھالتے اور خدمت علمی و دینی سے محروم رہ جاتے، (ص ۱۱ زیر عنوان "محسن کی شکرگزاری"

طرح طب قدیم کی تجدید کا وہ خواب جو حکیم صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، سرکار آصفیہ کے زیر سایہ پورا ہوا، ایسے ہی مولانا شبلی مرحوم نے قدیم اسلامی علوم کی تجدید کا جو خواب دیکھا تھا وہ بھی خدا کرے اسی سرکار کے زیر سایہ پورا ہو۔

انجمن ترقی اردو کے جلسہ میں علامہ کی تقریر

انجمن ترقی اردو کے دلی منتقل ہو جانے کے بعد یہاں انجمن کی ایک شاخ قائم ہو گئی ہے جو چند سرگرم عمل کام کرنیوالوں کے ہاتھوں میں ہے، اس کی طرف سے اردو کا ایک جلسہ ہوا جس میں اردو کی موجودہ صورت حال پر میں نے تقریر کی اور بتایا کہ ملک میں اس کی ترقی کے لیے کہاں کہاں کیا ہو رہا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو

یہاں اردو کا ایک اور ادارہ بھی دیکھا جس کا نام "ادارۂ ادبیات اردو" ہے اس کے چلانے والے زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے نوجوان گریجویٹ ہیں۔ جن کی سربراہی پروفیسر زور، عبد القادر سروری، عبد المجید صدیقی وغیرہ کر رہے ہیں، دو تین ہی سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے سو کے زیب کتابیں شائع کر دی ہیں، کچھ کتابوں اور اردو کے قدیم اخباروں کا سرمایہ بھی جمع ہو گیا ہے۔ اردو کے ہر دور کے شاعروں، مصنفوں اور ادیبوں کے مرقع بھی رکھے ہیں، اردو کی تاریخ کے نقشے بھی نہایت خوبصورتی سے بنائے ہیں۔

مدرسۂ نظامیہ میں تقریر

حیدرآباد میں علوم عربیہ کی ایک قدیم درسگاہ مدرسۂ نظامیہ ہے جس کو مولانا انوار اللہ خاں صاحب نے آج سے چالیس[1] برس پہلے قائم کیا تھا، آج کل اس کی

---

[1] یہ اندازہ سے تحریر فرمایا تھا، پھر اگلے ماہ کے شذرات میں اس کی تصحیح ان لفظوں میں فرمائی۔ "پچھلے پرچہ میں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کی عمر تقریباً چالیس پچاس سال لکھی تھی مگر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآباد سے مطلع فرماتے ہیں کہ اس کی عمر کا یہ ۶۵ واں سال ہے اللھم زد فزد" معارف اپریل ۴۰ء

نظارت مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی مفتی عدالت عالیہ کے ہاتھوں میں ہے، وزیر تعلیمات سرکار عالی نواب مہدی یار جنگ بہادر کی تحریک اور مفتی صاحب کی فرمائش سے میں نے اس مدرسہ کے اساتذہ کرام اور طلباء کے سامنے ڈیڑھ گھنٹے تک علوم اسلامیہ اور عربی نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح و تجدید[1] پر تقریر کی۔ علماء نے میرے مقصد سے اتفاق کیا اور تحریک کو پسند فرمایا

وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا

---

[1] ہندوستان، پاکستان بلکہ سارے عالم اسلام میں علماء تجدید نظام تعلیم پر اہل مدارس دینی اور ارباب جامعات کو متوجہ کرتے رہے۔ اب بھی کوئی نئے ایسے وحدانی نظام تعلیم کی بنا ڈالے جو مسلمان کی دینی اور دنیوی ضروریات کا کفیل ہو تو مسلمانوں کا ملی تشخص و تفوق ساری دنیا کو مسلم ہو جائے۔

چھٹا سفر حیدرآباد

فروری و مارچ ۱۹۴۴ء میں علامہ حیدرآباد تشریف لائے۔ قیام مولانا عبدالباری ندویؒ کے گھر رہا، مگر مہمان کی میزبانی کے فرائض مولانا عبدالباری اور مولانا مناظر احسن گیلانی (جو پاس ہی رہتے تھے) میں مشترک رہے اور کھانا ایک ساتھ ہی رہتا تھا، اسی سفر میں راقم الحروف کو علامہ کی ملاقات اور اُن سے ارادت کی وابستگی کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان دنوں علامہ پر اپنے مرشد اقدس حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی رحلت کا بڑا حزن و غم طاری تھا، جو چھ سات ہی ماہ قبل یعنی ۲۰ر جولائی ۴۳ء کو وصال فرما گئے تھے۔

ولی عہد کے ہاں چائے کی دعوت

ایک شام مولانا عبدالباری ندویؒ کے گھر پر علامہ کی خدمت میں حاضر تھا، مولانا گیلانی بھی تشریف فرما تھے۔ ایسے میں ولیعہد بہادر شہزادہ اعظم جاہ کے اتالیق صمدیار جنگ تشریف لائے۔ دور ہی سے انھوں نے علامہ کی خدمت میں فرشی سلام پیش کیا۔ علامہ ہم حاضرین سے یہ فرماتے ہوئے کہ آپ بیٹھے رہیں، اٹھ کر دو قدم آگے بڑھے اور نواب صمدیار جنگ نے ادب سے مصافحہ کیا ——— یہ حیدرآبادی امرار کی شرافت، تواضع اور اخلاق کی ادا تھی جو آج کس قدر ناپید ہے ——— صمدیار جنگ مودب بیٹھے اور عرض کیا کہ "شہزادہ ولیعہد نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ان کی طرف سے حضرت کی خدمت میں یہ درخواست کروں کہ کل وہ

لہ تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو تذکرہ سلیمان ص ۱۴۶ تا ص ۱۴۷

حضرت کے قدم کی برکت حاصل کرنا چاہتے ہیں، حضرت شہزادہ کے ساتھ چائے نوش فرمائیں"۔

حضرت علامہ کے متعلق عرض کر چکا کہ وہ اپنے مرشد اقدسؒ کے رنج فراق سے محزون تھے۔ علامہ نے معذرت کی کہ معاف رکھا جائے مگر نواب صمد یار جنگ نے مکرّر بڑی عاجزی سے علامہ کو یقین دلایا کہ یہ تحریک ان کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ ولیعہد بہادر نے از خود اس تمنّا کا اظہار فرمایا ہے اور وہ علامہ کی تشریف آوری کے مشتاق ہیں۔ اس اصرار پر علامہ نے دعوت منظور فرمائی اور دوسرے روز شام کو ولیعہد بہادر کے ہاں عصر و مغرب کے درمیان کچھ دیر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

ملوکی نظام کی بعض بُرائیاں مسلم مگر اس کی بعض خوبیاں، خصوصاً آداب و اخلاق، فرق مراتب کا پاس و لحاظ، سلیقہ، نظم و ضبط، اکھڑ اور کھُردرے جمہوری نظام کے آفریدہ ارباب اقتدار اور عام سرکاری حکام میں ڈھونڈے سے بھی کہاں ملے گا۔

دارالسّلام میں تقریر

مسلمانانِ دکن کی واحد نمائندہ جماعت "مجلس اتحاد المسلمین" نے شہر حیدر آباد کے ایک مرکزی مقام پر ایک وسیع زمین جس میں قدیم وضع کی دو عالیشان عمارتیں بھی شامل ہیں حاصل کر لی تھیں۔ انہی میں مجلس کا صدر دفتر بھی تھا اور طلبا کا دارالاقامہ بھی اور اسی میدان میں مجلس کے عام جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اور مسلمانان دکن کے دلوں کے قائد نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ سے ایسا ہی تعلق تھا۔ جیسے ایک باادب شاگرد کو اپنے اُستادِ شفیق سے ہونا چاہیے۔ وہ علامہؒ کو ایک غیر جانبدار محقق دین اور بے مثل مورخِ اسلام مانتے تھے ان کی ہر بات کو خوب دل لگا کر

(ii) مسلمان خیرِ اُمت بن کر ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں۔ اس لیئے ان پر اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی بڑی ذمہ داری عائد ہے، اگر ان میں وہ بُرائیاں پیدا ہو جائیں جو غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں تو وہ دنیوی اعتبار سے غیروں سے بھی زیادہ جلد تباہ ہو جائیں گے۔

اس کی مثال بڑے موثر انداز میں یہ بیان فرمائی ہے:-

"اے حضرات! جوتے کو غلاظت لگ جائے تو پھر بھی چل جاتا ہے لیکن ٹوپی کو لگ جائے تو فوراً اتار پھینکتے ہیں۔"

(iii) حکومت کُفر کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن بے انصافی کے ساتھ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔

(iv) حکومت بالذات مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصود بھی تبلیغ و اشاعتِ دین ہے مگر افسوس ہے کہ حکومت حیدرآباد اس فریضہ سے یکسر غافل ہے۔

(v) حیدرآبادی مسلمانوں کا ۱۲ فی صدی کی اقلیت میں ہوتے ہوئے صرف سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کیئے بیٹھنا خطرناک ہے۔ ضرورت ہے کہ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت پر بھی قابو حاصل کریں۔

قائدِ ملت کی شانِ تواضع

حضرت والا کی تقریر ختم ہوتی تو قائدِ ملت اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ان دنوں اُن کی تقریر پر حکومت کی طرف سے امتناع عائد تھا، مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں فرمایا کہ میں تو زبان بندی کی مدت کاٹ رہا ہوں اس لیئے میرا تقریر کرنا خلافِ قانون ہوگا البتہ جو باتیں ابھی بیان کی گئی ہیں ان کا اعادہ کر دوں تو اس میں کیا ہرج ہے ـــــ چنانچہ پہلے تو مولانا گیلانیؒ کی تقریر کا حاصل مدعا پیش کیا کیونکہ اس روز مولانا کی تقریر کچھ اُلجھ گئی تھی پھر فرمانے لگے کہ میری کیا مجال کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تقریر پر تبصرہ کی جرأت کروں، وہ بحرِ علم کے غواص ہیں، میرے بازار کی رونق انہی کے نکالے ہوئے جواہر سے ہے۔ میں نے

سنتے اور فقہی مسائل میں جہاں دیوبندی اور بریلوی اسکول میں اختلاف نظر آتا، انہی کے
قول کو قولِ فیصل سمجھتے تھے۔

انہی دنوں جب راقم عاصم کو حضرت والا رح سے ابھی ابھی تعارف حاصل ہوا تھا۔
قائدِ ملت مرحوم نے مقامی اخبارات میں ایک شخصی اپیل شائع کی کہ اگلے دن علامہ
سیّد سلیمان ندوی رح دارالسلام میں خطاب فرمائیں گے مسلمان زیادہ سے زیادہ اس میں
شریک ہوں ــــــ اپیل اور مسلمانوں کے محبوب قائدِ ملت کی طرف سے! دوسرے
روز چار بجتے بجتے دارالسلام میں خواص و عوام کا ایک زبردست اجتماع ہوگیا۔ پہلی تقریر
مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی رح کی ہوئی اور پھر حضرت علامہ رحمتہ اللہ علیہ نے کوئی گھنٹہ بھر
خطاب فرمایا۔

موضوع جہاں تک خیال پڑتا ہے۔ قرآن پاک کی آیت "کنتم خیرامۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"
کو موضوع بنایا گیا تھا، حضرت رح نے پہلے آیتِ پاک نہایت سادگی و ادب کے ساتھ
تلاوت فرمائی اور پھر بلا تمہید و تکلف راست نفسِ مضمون پر آگئے، تقریر ایسی مرتب
اور رواں تھی کہ گویا قلم بند ہے اور گو بیان تمام تر علمی اور جوش سے خالی تھا لیکن
سوز و جذب کچھ ایسا تھا کہ ہزاروں کا مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اور ضرورت بھی کامل
توجہ ہی کی تھی کیونکہ سلسلۂ تقریر کی ہر کڑی یکساں اہم اور اوّل و آخر سے پیوست تھی۔
میں قائدِ ملت مرحوم کے قریب ہی بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ان پر وجد کی سی کیفیت
طاری ہو ہو جاتی تھی اور دبی زبان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کے کلمات اعتراف
نکلتے جا رہے تھے۔

حاصلِ بیان حضرت والا رح کی اس بصیرت افروز تقریر کا حاصل آج تک یاد ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لیے اس میں
سرمایۂ کامرانی ہے، فرمایا:۔

(۱) اسلام کا سرچشمۂ صافی جہاں سے پھوٹا ہے وہیں سے شفاف پانی مل سکتا ہے۔

خطبات مدراس کورٹ رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا ہے۔

(ص ص ۴۲۲ تا ۴۲۴)

حیدر آباد ختم ہو چکا مگر علامہ نے حیات اجتماعی کے بقا کے جو گر بیان فرمائے وہ ہر زمانی اہمیت کے نکات ہیں اور آج پاکستان کے حکمراں طبقہ اور عوام کو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اگلا گرا پچھلا ہوشیار!!

والیٔ مملکت اور اہلِ شہر کی ندوہ کو مالی اعانت

علامہ کا یہ سفر دار العلوم ندوہ کے لیئے مالی سہولت کی فراہمی کے لیئے ہوا تھا۔ "بہادر یار جنگ پر تحریر فرمودہ" وفیات میں علامہ کا یہ جملہ موجود ہے۔

"ابھی اسی سال فروری مارچ اور وسط اپریل تک حیدر آباد میں دار العلوم ندوہ کے سلسلہ سے تقریباً روزانہ ان (یعنی بہادر یار جنگ) سے ملنا جلنا اور ساتھ لوگوں کے پاس آنا جانا رہا۔"[1]

علامہ مقصد سفر میں کامیاب رہے۔ اس کی تفصیل شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے معارف بابتہ اپریل ۴۴ء میں بصورت شذرات یہ ملتی ہے:۔

"زمانہ کے عام اقتصادی حالات اور بعض مستقل آمدنیوں کے رک جانے کی وجہ سے، ادھر کچھ دنوں سے دار العلوم ندوہ کی مالی حالت بہت ناقابل اطمینان ہو گئی تھی، بڑی مشکل سے اخراجات چلتے تھے، ندوہ کے دوسرے صیغوں کی مد سے کئی ہزار کا قرض دار العلوم پر ہو گیا تھا، ان حالات میں اس کی دستگیری کے لیئے کارکنوں کی نگاہ اسی اسلامی ریاست کی طرف اٹھی جو ہندوستان کے تمام اسلامی اداروں کا ملجا و ماویٰ ہے اور جیسا کہ اس سرکار سے علم نوازی کی توقع تھی، بارگاہِ سلطانی سے ندوہ کی سابق تین سو

---

[1] یادرفتگان ص ۲۹۳

ماہوار کا اضافہ منظور ہوا، اور متفرق قرضوں کی ادائیگی کے لیے پندرہ ہزار نقد کی اُمید دلائی گئی۔ یقین ہے کہ عام مسلمان اور تمام وابستگانِ ندوہ اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی اس دین پروری اور علم نوازی کے منت پذیر و سپاس گذار ہوں گے۔ اس شاہانہ امداد کے علاوہ حیدر آباد کے اصحابِ خیر سے آٹھ ہزار نقد چندہ وصول ہوا۔ اور ابھی کچھ وعدے ہیں، جن کے انشاء اللہ جلد پورا ہونے کی توقع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان محسنین کو اس کارِ خیر کا صلہ عطا فرمائے، اس گراں قدر امداد سے ندوہ کو فی الجملہ بڑی تقویت حاصل ہوگئی۔"

(شذرات (۱۱))

بہادر یار جنگ کا علامہ کے ساتھ خصوصی ربط

اس سفر کے دوران علامہ سے بہادر یار جنگ کا خاص ربط رہا۔ مگر اس کی کسی کو خبر نہ تھی ایک مرتبہ راقم الحروف کی موجودگی میں خود نواب بہادر یار جنگ کے دولت کدہ پر پروفیسر غلام دستگیر رشید صاحب نے (جو نواب صاحب کے بے تکلف دوست تھے) کہا "آج کل علامہ سید سلیمان ندوی صاحب حیدر آباد میں ہیں۔ نواب صاحب آپ کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔" نواب صاحب مسکرائے اور کچھ جواب نہ دیا۔ رشید صاحب کو افسوس ہوا کہ نواب صاحب نے ان کی بات ٹال دی۔ مگر جب چند ہی ماہ بعد نواب صاحب نے سرعت شہادت پائی اور علامہ نے ان کی وفات حسرت آیات پر تفصیلی اور اثر انگیز وفیات لکھے تو اس میں یہ جملہ پڑھ کر پروفیسر رشید حیران رہ گئے کہ

> "اس سال فروری اور مارچ اور نصف اپریل کے چند مہینے ندوہ کی قومی امداد کے سلسلے میں ان سے بہت قریب گزرے، ہر دوسرے تیسرے ان کے مکان پر جانا ہوا۔"

واقعہ یہ کہ بہادر یار جنگ نے علامہ سے علمی استفادہ کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا۔

ساتواں یا آخری سفر حیدر آباد

ایک کشفی لطیفہ

ابھی تو مارچ ۱۹۴۴ء میں علامہ حیدر آباد آچکے تھے، ہم تازہ ارادت مندوں کو یہ حسرت تھی کہ نہ جانے کب دوبارہ تشریف لائیں اور صحبتِ بابرکت میسّر آئے۔ ان دنوں میرے ایک دوست عزیز کو حدیث پڑھانے مدراس کے متوطن، ایک ضعیف العمر باخدا، صاحب کشف عالم ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ میں بھی اکثر اس وقت وہاں موجود رہتا۔ ایک روز جب وہ پڑھا رہے تھے حسب معمول چائے کی ایک پیالی میں نے ان کے آگے رکھ دی، میری طرف دیکھ کر ہنسے، شاید میرے حسرت زدہ دل کا ان پر انکشاف ہوا، پوچھنے لگے آپ کے مرشد کب آئیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی تو آکر گئے ہیں۔ میرے اس جواب پر وہ پھر ہنسے اور سر ہلاتے ہوئے فرمانے لگے "نہیں، ابھی آتیں، جلدی آتیں" (یعنی نہیں، ابھی آتے ہیں، جلد ہی آتے ہیں) بات آئی گئی ہوگئی مگر ؏

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

نو ہی مہینے گذرے ہوں گے کہ ؏

باز آمد شاہ مادر کوئے ما

علامہ کی آمد

اواخر دسمبر ۱۹۴۴ء میں شہر مدراس میں مورخین ہند کی کانفرنس تھی، اس کے ایک شعبہ کی صدارت کے لیے علامہ مدراس گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ممبئی آئے جہاں

جمعیۃ العلمائے صوبہ بمبئی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور پھر جنوری ۱۹۴۴ء کی کسی تاریخ میں حیدرآباد تشریف لاتے۔ اس دفعہ کی آمد کا مقصد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیئے رقمی امداد حاصل کرنا تھا صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی، ریاح کا دباؤ سینہ اور خاص کر قلب کی طرف رہنے لگا تھا بے چینی سی رہتی تھی، اس لیئے زیادہ وقت اپنے میزبان احباب مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا گیلانی کے ساتھ گذارا۔

خان بہادر محمد مظہر کی میزبانی

اس کی جو تفصیل راقم نے تذکرۂ سلیمان میں لکھی ہے وہ ذیل میں نقل کی جاتی ہے :۔ "ان دنوں حضرت تھانوی کے علاتی بھائی خان بہادر محمد مظہر جو حکومت ہند میں بھی بڑے عہدے پر رہ چکے تھے۔ کمشنر "انسداد رشوت ستانی" کی حیثیت سے حیدرآباد آئے اور جوبلی ہل پر "پریم ولا" میں سرکاری طور پر مقیم تھے، مظہر صاحب مرحوم شرافت، ذہانت اور بذلہ سنجی میں فرد تھے۔ ادھر مولانا تھانوی سے ان کے مرتبہ نصاب تعلیم کی تکمیل بھی کی تھی، اس کے لیئے ان کی دینی معلومات بھی معیاری تھیں اور ذہانت وفطانت کی بنا پر اچھے اچھے علماء کو بھی گفتگو میں زیر کر جاتے تھے۔ ہمارے حضرت والا سے مرحوم کو خاص محبت تھی اور بڑا احترام فرماتے تھے اور خود حضرت کو بھی ان کا پاس خاطر ملحوظ رہتا تھا۔ مظہر صاحب مرحوم کا بار بار اصرار رہا کہ حضرت والا ان کے گھر مقیم رہیں لیکن حضرت والا نے ہمیشہ دو عذر ظاہر فرمائے، ایک تو یہ کہ وہاں مسجد کا قرب میسّر نہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ احباب (مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری مدظلہم) سے دوری رہے گی لیکن مظہر صاحب کہاں چھوڑنے والے تھے، فرمانے لگے کہ حضرت مع احباب کے وہاں تشریف لے چلیں، راست ان حضرات سے بھی مظہر صاحب نے فرمایا کہ وہ اس مخلصانہ دعوت کو رد نہ فرمائیں، اصرار کی اس انتہا پر اپنے احباب سے پندرہ دن کی اجازت چاہی اور جوبلی ہل تشریف لے گئے۔

"پریم ولا" کے راحت کدہ میں ایک اہل اللہ کے لیئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس کے آس پاس دور دور تک کوئی مسجد موجود نہ تھی، سرمایہ دار اور فیشن پرست طبقہ کے محلہ میں خدا پرستی کے آثار و علامات کی تلاش بے سود تھی۔ البتہ جوبلی ہل کی سرحدی سڑک پر

ایک مسجد ضرور تھی جو پیچھے راستہ سے کوئی میل بھر کی مسافت پر ہوگی۔

البتہ منظر صاحب کی قیام گاہ سے ایک پگ ڈنڈی کوئی دو فرلانگ لانبی وہاں تک پہنچتی تھی، حضرت والا رح کو دیکھا کہ باوجود ریاحی تکلیف اور خرابیٔ صحت کے اکثر نماز کے لیئے اسی راستہ سے مسجد جاتے آتے تھے، خدا کی شان کہ وہ پگ ڈنڈی جو مفلسوں اور ناداروں کی پامالی کا نشان تھی۔ ایک فقیر الی اللہ کے قدوم سے مشرف ہوکر ہمت وعزیمت کا خط جلی بن گئی!

جناب منظر صاحب کے ہاں جتنے دن قیام رہا، عصر کے بعد مغرب تک کا وقت بڑا قیمتی اور پرلطف رہتا تھا، مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری صاحب تو روزانہ ہی تشریف لاتے تھے، ان کے علاوہ اور بھی چند قدر شناس (جن میں پروفیسر غلام دستگیر رشید اور ان کے دوست خواجہ محمد احمد ناظم اعداد وشمار خاص تھے) جمع ہوجاتے تھے۔

ان محفلوں میں باتوں باتوں میں کتنی علمی گتھیاں سلجھ جاتی تھیں اور کتنے عارفانہ عقدے حل ہوجاتے تھے۔ تقدیر اور خیر و شر کے مسئلہ کی سلیس تشفی بخش توجیہہ پہلی مرتبہ کانوں نے یہیں سنی۔ ذوق وشوق کا درجہ اور ان کی حیثیت کا صحیح ادراک یہیں حاصل ہوا، سنت میں شائستگی اور حسنِ سلیقہ کا جو اعلیٰ معیار موجود ہے اس کا درس بھی یہیں لطیف انداز میں ملا۔"

اس سفر سے متعلق علامہ ماہ اپریل ۱۹۴۵ء کے معارف کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:-

"خاکسار تین ماہ کے سفر مدراس وبمبئی حیدرآباد دکن و وردھا وبھوپال سے مارچ کے وسط میں آیا۔ مدراس میں اواخر دسمبر ۴۴ء میں مورخین ہند کی کانفرنس تھی، جس کے ایک شعبہ کی صدارت کے لیئے مدراس کا سفر کیا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شعبہ کی صدارت

کے لیئے اتنا لمبا سفر کرنا، اور وہ بھی صحت کی خرابی کی حالت میں کسی نئے حصولِ اعزاز کی غرض سے نہ تھا بلکہ ان تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لیئے تھا۔ جن سے اب تک چشم پوشی کی گئی ہے اور جن کے اظہار کا اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا تھا۔"

ان شذرات میں زیادہ تفصیل سفر مدراس و بمبئی و وردھا کی ہے، حیدرآباد سے متعلق دوسرا شذرہ یہ ملتا ہے:۔

"حیدرآباد دکن کے سفر میں خرابیٔ صحت کی بنا پر قصداً تقریروں سے احتراز کیا گیا، صرف سکندرآباد کے نوجوانوں کے ایک مختصر سے مجمع میں اصلاح کے بنیادی طریق پر گفتگو کی گئی جس کو اکثر نوجوانوں نے پسند کیا۔"

حیدرآباد کے حالات پر اضطراب

۱۹۴۵ء کے بعد علامہ پھر حیدرآباد تو نہیں آئے، مگر ہر دردمند اور بہی خواہ کی طرح ان کی نظر حیدرآباد کی ناعاقبت اندیش سیاست پر برابر لگی ہوئی تھی اور وہ اس کے انجام کی پیش بینی کی وجہ سے سخت مضطرب رہتے تھے، ۱۹۴۷ء میں جب میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے "ارے بھئی آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ ان شعلہ بیان تقریروں کے (جو صدر مجلس اتحاد المسلمین سید قاسم رضوی صاحب کر رہے تھے) عواقب پر بھی کچھ نظر ہے؟ حکومت ہند میں جو کھچڑی پک رہی ہے اور خود آپ کے ہاں جو سازش چل رہی ہے، وہ بھی معلوم ہے؟"——
میرے پاس لب بندی اور شرمساری کے سوا جواب کی صورت ہی کیا تھی۔

فکر کو گوشمالی مل چکی تھی، وطن لوٹ کر حالات کے ظاہر اور اندرون کو سوزخ سوزخ کر بڑی وحشت ہونے لگی، جو کل ہونے والا تھا، نگاہ آج ہی اس کو دیکھ رہی تھی، اپنا اضطراب عریضہ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کے ذریعہ علامہ کی خدمت میں پیش کر دیا، جواب باصواب جو ملا اس کا اصل جزو یہ تھا:

"اس نزاکت احوال کا دفعیہ اور علاج کیا آپ کے اختیار میں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ اضطراب قلبی و ایمانی کیوں؟ اضطراب طبعی میں حرج نہیں۔ اس کا علاج واستعینوا بالصبر والصلوٰة ہے۔ حیدرآباد کو اپنے دو سو برس کی غلطیٓ کا خمیازہ بھگتنا

ٓ یعنی اشاعت دین سے غفلت اور مقصد حکمرانی سے بے خبری جو مغلوں میں رہی (بہ استثنائے اورنگ زیب) وہ یہاں بھی رہی۔

ہے، رسمی دینداری اور اشاعت رسوم و بدعات اور پھر تشیع کے ساتھ تو معموری ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ استغفار کی توفیق دیں'، (مراد والئی سلطنت کو) [1]

بالآخر حیدرآباد ختم ہوگیا مگر خط کشیدہ تحریر کا لفظ لفظ اہل پاکستان کے لیئے آج بھی للکار ہے، اور اس کی للکار ہے جو قوموں کے عروج و زوال کا آگاہ، اسلام کا مزاج شناس اور ملت محمدیہ کا ساری عمر کا غمخوار تھا

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۵۸۸

سماجی نوعیتِ تعلق کی جھلکیاں

رگ وپے میں تصوّف

علامہ کی زبان سے بھی یہ بات سُنی ہے اور اُن کی معرکتہ الآرا تصنیف خیام میں بھی یہ جُملہ موجود ہے کہ :۔

"حیدرآباد کی رگ وپے میں تصوّف اور وحدۃ الوجود کے مسائل سرایت کیے ہوتے ہیں۔

(ص ۳۳ س ۶)

مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حضرت شاہ کمال اللہؒ (عرف مچھلی والے شاہ صاحب) اور ان جیسے بعض بزرگوں کی وجہ سے ویدانتی وحدۃ الوجود کی کافرانہ تعبیر کی تردید بھی خوب ہوئی اور قالاً وحالاً صحیح تصوّر پروان چڑھا تھا ــــــ باقی علامہ کا یہ ارشاد درست ہے کہ حیدرآباد میں وحدۃ الشہود کے بجائے وحدۃ الوجود ہی کے نظریہ کا غلبہ رہا ــــــ ایک مرتبہ راقم بے علم و بے حال اپنی ایک حمد ــــــ جو درحقیقت اُلٰہی کے فیضان کا انعکاسی ظہور تھا ــــــ علامہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں ایک شعر یہ ہے ؎

تو نورِ نظر، عینِ نظر و زنگہم دور
چوں جاں کہ بہ تن ہست ولے دور ز تن ہست

علامہ جب اس شعر پر پہنچے تو نظریں اٹھا کر اس عاجز کو دیکھا، مسکراتے ہوئے فرمایا "اچھا" یہ اُن کی پسند کا انداز تھا ــــــ مقصود اس درازکلامی سے یہ ہے

کہ علامہ کے جملہ میں محض حیدر آبادی مزاج کے حقیقت کا اظہار ہے، اس کی تنقیص نہیں، امجد حیدر آبادی علامہ کے پسندیدہ شاعر تھے وہ اسی صحیح وجودی مزاج کے رنگ میں غرق ہیں۔[1]

جامہ وار کی شیروانی

مجھ سے فرمایا کہ میری جب شادی ہوئی تھی۔ تو شیروانی کا کپڑا "جامہ وار" آپ ہی کے حیدر آباد سے آیا تھا۔"

"جامہ وار" نہ صرف ایک نفیس، خوش رنگ پھولدار مگر نہایت ثقہ کپڑا تھا بلکہ بڑا دیرپا بھی تھا۔ میں نے اپنے قیام بھوپال میں دیکھا کہ علامہ نے اپنی یہ شیروانی چھوٹی کرواکے اپنے صاحبزادہ سلمان میاں (حال ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدر شعبۂ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی افریقہ) کو دی تھی۔ اور وہ پہنتے تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔

حیدر آبادی رشتہ

علامہ کی پہلی رفیقۂ حیات تیرہ برس کی رفاقت کے بعد جب ۱۲ اپریل ۱۹۱۷ء[2] کو داغ مفارقت دے گئیں تو اس سانحہ کا بڑا شدید اثر علامہ کے ذہن و قلب پر رہا۔ علامہ کی عمر اس وقت کوئی بتیس تینتیس برس کی ہوگی۔ علامہ کا ارادہ نکاح ثانی کا نہ تھا مگر ان کے والد ماجد اور چچا اس پر مصر تھے[3] ——— یہ بات کہیں مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کے علم میں بھی آئی۔

ٹھیٹھ حیدر آباد کے تو نہیں مگر سکندر آباد جو عرف عام میں حیدر آباد ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے، یہاں کے ایک بڑے دیندار، امیر کبیر صاحب خیر تاجر

---

[1] خود علامہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں ہی نظریات کو "ناقص تعبیرات" سمجھتے تھے اور توحید تنزیہی کے قائل تھے [2] حیات سلیمان ص ۱۰۶ [3] ایضاً ص ۲۰۳

احمد علاء الدین صاحب مرحوم تھے، خواجہ حسن نظامی صاحب کے ان سے
خاصے روابط تھے، خواجہ صاحب نے احمد علاء الدین صاحب کی صاحبزادی
کا رشتہ باضابطہ طور پر علامہ کو بھیجا۔

علامہ ہم سے فرماتے تھے کہ:

"میں نے خواجہ صاحب کو جواب میں یہ لکھا کہ حیدرآباد
کے ایک بڑے امیر کی لڑکی اعظم گڑھ کے ایک بڑے فقیر
کے گھر کیسے آسکتی ہے؟"

اس پر بات ختم ہو گئی۔

سلطنت آصفیہ کا سنہ بعینہٖ سنہ جلالی نہیں!

سرکار آصفی میں جو شمسی سنہ رائج تھا وہ قدرے ترمیم کے ساتھ وہی تھا جو آلِ تیمور نے رائج کیا تھا۔ علامہ نے خیام کی علم ہیئت میں مہارت اور شمسی سال کے مہینوں کی تقسیم اور ایام کے تعین میں اس کے کمال کے تذکرہ کے ضمن میں سرکار نظام کے مروجہ سال کی تحقیق فرمائی ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور معلومات آفریں بھی۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:-

"اکبر کے زمانہ میں ہندوستان میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے قاعدہ بالا میں (یعنی سال وماہ کو تحویل برج کے وقت سے شروع کرنا) ایک اور ترقی کی، رصد گورگانی یعنی تیمور گورگان کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں جو رصد خانہ ۸۲۳ھ میں قائم کیا تھا۔ اس کی تحقیق پر بنیاد رکھ کر سال کے ۱۲ مہینوں کے ایام کو تیس تیس یوم لے کر آخر میں پانچ دن بڑھانے کے بجائے رومیوں کی طرح یہ کیا کہ ان پانچ دنوں کو بھی مہینوں میں تقسیم کر دیا اس سے گو مہینوں کے ایام میں برابری قائم نہ رہی مگر ہر سال پانچ یوم کے اضافہ کی دقت نکل گئی اور تقسیم اس طرح ہوئی کہ پہلے دو مہینے اکتیس اکتیس کے، پھر دو ماہ تیس کے، دو ماہ انتیس کے، آخری دو مہینے تیس تیس کے۔

زوردیں	اردی بہشت	خورداد	تیر	امرداد	شہریور	مہر	ابان	آذر	دی	بہمن	اسفندار
۳۱	۳۱	۳۲	۳۱	۳۱	۳۱	۳۰	۳۰	۲۹	۲۹	۳۰	۳۰

یہ کل ۳۶۵ دن ہوتے، باقی سالانہ چھ گھنٹوں کی کسر جو ہر چار سال

میں ایک دن کا فرق ڈالتی ہے اس کا کوئی علاج اس میں نہیں رکھا گیا، اس جدید تاریخ کا نام تاریخ الہٰی قرار پایا[۱]

یہی اب تک سرکار نظام میں جو ہر معنی میں سلطنت آل تیمور کی یادگار رہے اس فرق کے ساتھ جاری ہے کہ ایک دن آذر میں جو سنہ الہٰی میں ۲۹ دنوں کا تھا، بڑھا کر اس کو تیس دنوں کا کر دیا گیا ہے لیکن اس میں بھی کسرات یعنی چھ گھنٹوں کے اضافہ کی کوئی شکل نہیں رکھی گئی ہے۔ یہ چھ گھنٹے سالانہ چار سال میں ایک دن اور ایک سو بیس برس میں ایک مہینہ ہو جاتے ہیں حالانکہ خیام نے ہر چوتھے سال ایک دن کے اضافہ سے یہ کسر مٹا دی تھی، موجودہ انگریزی طریقۂ حساب جو گریگورین اصول پر مبنی ہے ہر چار سال کے بعد فروری میں ایک دن بڑھا کر پورا کر دیا جاتا ہے۔

بہر حال اس چار سال کے بعد ایک دن اضافہ نہ کرنے کے سبب سے ایک سو بیس برس کے بعد ایک مہینہ کا تغیر لازمی تھا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سرکار نظام کے دفاتر میں ہر ایک سو بیس برس کے بعد ایک مہینہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ ۱۸۸۵ء سے پہلے سال یکم آبان سے شروع ہوتا تھا۔ اور ۱۸۸۵ء میں ایک ماہ چھوڑ کر ماہ آذر سے شروع ہونے لگا[۲] اور اب تک اسی پر عمل ہے، البتہ مہینوں کے دنوں میں بعد کو یہ ترمیم کی گئی ہے کہ اب بتیس دنوں کا کوئی مہینہ نہیں رکھا گیا ہے۔ خورداد کے ۳۲ دنوں میں سے ایک دن نکال کر آذر میں ایک دن بڑھا کر ۲۹ کے بجائے ۳۰ کر دیا گیا ہے، موجودہ صورت یہ ہے:۔

آذر	دی	بہمن	اسفندار	فوردین	اردی بہشت	خورداد	تیر	امرداد
۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۳۱	۳۱	۳۱	۳۱	۳۱

شہریور	مہر	آبان
۳۱	۳۰	۳۰

---

[۱] آئین اکبری۔ علامی۔ ابو الفضل۔ جلد اوّل۔ آئین تاریخ الہٰی و جامع بہادر خانی ص۲۹۲، ص۲۹۴

[۲] بڑی جنتری رحمت اللہ رعد مرحوم بابتہ ۱۹۰۵ء

ان تفصیلات سے معلوم ہو گا کہ سنہ الہٰی بعینہٖ سنہ جلالی نہیں اور
نہ وہ خیّام کے اصول کے مطابق ہے۔"

دیکھئے خیام
مصنفہ علامہ ندویؒ ص۱۳۱ تا ص۱۳۳

حیدر آباد کا مذکورہ سنہ، سنہ فصلی کہلاتا تھا اور اس سنہ کے اظہار
کے لیئے تحریر میں اشارہ "ف"، کا استعمال ہوتا تھا۔ جیسے عیسوی سنہ کے لیئے "ء"
اور سنہ ہجری کے لیئے "ھ" یا "ہ" کا اشارہ مستعمل و مروج ہے۔

حیدر آباد کی بعض شخصیات جن سے علّامہ کا تعلق رہا

عماد الملک سیّد حسین بلگرامی

آصف سادس اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں کے عہدِ بابرکت میں عماد الملک سررشتۂ تعلیمات کے ناظم (ڈائرکٹر) اور شہزادہ ولی عہد نواب میر عثمان علی خاں کے اتالیق بھی تھے، مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے ان سے خصوصی تعلقات تھے، وہ شبلی کے لائق فخر شاگرد علّامہ سلیمان سے غائبانہ واقف تھے، ملاقات کی جو صورت نکلی اس کی تفصیل علّامہ نے خود یہ لکھی ہے:-

"خاکسار کی ملاقات ان سے پہلے پہل حیدر آباد میں ہوئی جس کی صورت یہ ہوئی کہ مرحوم نے مولانا شبلی کی تحریک سے اپنا جو کتب خانہ ندوہ کو دے دیا تھا، اس کتب خانہ کو حیدر آباد سے لانے کے لیے مولانا مرحوم نے میرا انتخاب کیا چنانچہ سب سے پہلی دفعہ میں (۱۹۱۰ء میں) حیدر آباد روانہ ہوا جناب مولوی عبد الغنی صاحب وارثی کے یہاں جو میرے وطن کے قریب کے اور عزیز بھی تھے اور مولانا کے دوست تھے، قیام ہوا، اور انھوں نے مولانا شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق نواب صاحب سے جاکر ملایا اور اس سلسلہ سے تقریباً ایک مہینہ تک نواب صاحب کے پاس روزانہ آنے جانے کا کام جاری رہا، وہ ایک ایک کتاب نکال کر مجھے دیتے تھے اور میں اس کو علیحدہ رکھتا جاتا تھا، اس کے بعد سے آخر

عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ خصوصاً الاستاذ رحمۃ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی ان کی شفقت بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے..... حیدرآباد جب جاتا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے، اسلامی علوم و فنون و تمدن و تاریخ گفتگو کا موضوع ہوتا..... اخیر زمانہ میں جب ان سے ملاقات ہوتی، عربی کی الف لیلہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے تمدن پر ایک کتاب لکھنے کی برابر فرمائش کرتے تھے۔"[۱]

مولانا حیدر علی نظم طباطبائی

نواب حیدر یار جنگ کے خطاب سے مشرف تھے، نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر رہے۔ شرح غالب اور گریز ایلیجی (GREY'S ELEGY) کے اردو منظوم ترجمہ "گورِ غریباں" کی وجہ سے علمی دنیا میں ان کے نام کو دوام حاصل ہے۔ علامہ سید سلیمان نے لکھا ہے کہ

"حیدرآباد دکن کے سفر میں اخیر وقت میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔"[۲]

محمد مارما ڈیوک پکھتال

قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ "THE GLORIOUS QURAN" نے جس کا انتساب پکھتال نے "ہز اکزالٹیڈ ہائینس دی نظام" کے نام کیا ہے، خود ان کے نام کو شہرت دوام بخش دی ہے۔ علامہ کا ان سے تعلق ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۹۲۰ء میں لندن میں اُن سے جمعہ کی نماز میں اسلامی جماعت خانہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی..... لندن میں ان سے گھنٹوں باتیں ہوا کرتی

---

[۱] یادِ رفتگان صفحات ۱، ۲، ۷، [۲] ایضاً صفحہ ۱۴۴

تھیں ..... پھر وہ حیدرآباد دکن چادر گھاٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر[1] اور وہاں کی سول سروس ہاؤس کے اتالیق ہو گئے تھے اس زمانہ میں جب حیدرآباد جانا ہوا، محبت سے مجھے اپنے ہاں بلاتے رہے ...... ۱۹۲۷ء میں جب مدراس میں ان سے ملاقات ہوئی تو اپنے انگریزی ترجمہ (قرآن) کا ذکر کیا اور سورۃ مریم کا ترجمہ دیکھنے کو دیا، وہ کہتے تھے کہ مولوی محمد علی لاہوری کے غلط سلط ترجمہ کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے شرماتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ اس کا دلنشین ترجمہ کروں جو دلوں کو گرما دے چنانچہ حیدرآباد کی مالی امداد سے مصر جا کر اس ترجمہ کو پورا کیا اور چھپا[2]، یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔"[3]

جلیل حسن فصاحت جنگ جلیل

آصف سابع میر عثمان علی خاں مرحوم کے استاد تھے۔ اور اپنے دور کے بلند پایہ اساتذۂ فن شاعری میں ان کا شمار تھا، اُن سے علامہ کے تعلق کی داستان جو خود علامہ کی زبان سے بیان ہوئی ہے، یہ ہے:۔

"صدیق حسن صاحب آثر (مانکپوری) حضرت جلیل کے فرزند تھے اور اوران سے اور مجھ سے شعر و ادب کی دلچسپی کے رشتہ سے یارانہ تھا، اسی تعلق میں اُن کے والد ماجد کی ______

______ حضرت امیر (مینائی) مرحوم کے ساتھ شاگردی کی نسبت نے محبت کی گرہ کو اور زیادہ استوار بنا دیا تھا[4] ..... خاکسار کو

---

[1] حیدرآباد شہر کے دو ہائی اسکول یعنی دارالعلوم ہائی اسکول اور چادر گھاٹ ہائی اسکول کو خصوصی اسٹیٹس حاصل تھا اس لئے ان ہائی اسکولوں کے سربراہ بجائے ہیڈ ماسٹر کے "پرنسپال" کہلاتے تھے۔ [2] پہلی بار یہ ترجمہ حیدرآباد کے گورنمنٹ سنٹرل پریس سے ۱۹۳۸ء نہایت اعلیٰ کاغذ کتابت وطباعت کے ساتھ دو جلدوں میں چھپ کر نکلا تھا [3] یادرفتگان صفحات ۱۷۱، ۱۷۲ [4] امیر مینائی کی مرآۃ الغیب کے علامہ بہت گرویدہ تھے۔

سب سے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ میں لانے کے سلسلہ میں حضرت الاستاد مرحوم کے حسب ایما حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی، کشاں کشاں مجھے ان کے آستانے تک لے گئی۔ بڑی محبت و شفقت سے ملے، اس کے بعد جب کبھی حیدر آباد جانا ہوا، ان کے ہاں ضرور حاضری دی، پرانی وضعداری اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے سنی جائے گی کہ اُن سے پہلی ملاقات جس مکان، مکان کے جس سائبان اور سائبان کی جس سمت میں، جس کرسی پر، جس ہیئت کذائی سے ہوئی تھی، آخیر ملاقات بھی اسی مکان میں، اسی سائبان میں، اسی کرسی پر اور اسی صورت میں ہوتی .... ابھی آخری زمانہ کی حاضری پر جو جنوری ۴۵ء میں ہوئی، دیدار نہ ہو سکا، ایسے بیمار تھے کہ ذی فراش تھے نقل و حرکت کی ممانعت تھی، یہی علالت کم و بیش قائم رہی اور مرض الموت ثابت ہوئی، محلہ سلطان پورہ کے جس کرایہ کے مکان میں رختِ اقامت ڈالا، اخیر تک اسی میں گزار دیا[1]

مولانا عبداللہ العمادی

مولانا عمادی سے علامہ کا تعلق قدیم تھا۔ ۱۹۰۵ء میں ملاقات کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جب وہ مولانا شبلی نعمانی معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء کی خدمت میں آنے جانے لگے تھے[2] پھر ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے جب الہلال نمودار ہوا تو چند ماہ بعد اس کی ادارت میں علامہ شامل ہوتے اور ان کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا عمادی بھی وہیں آگئے اور چند مہینوں تک دونوں ایک ہی ساتھ ایک جگہ کام کرتے رہے۔ پھر الگ ہو گئے[3]

---

[1] یادرفتگان صفحات ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۲ [3] ایضاً صفحہ ۳۵۳

جب (غالباً ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ) جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے تحت دارالترجمہ قائم ہوا۔ تو مولانا عمادی اس سے منسلک ہوکر حیدرآباد آئے اور حیدرآباد ہی میں پیوندِ خاک ہو گئے۔ علامہ سے ان کے مراسم کا اندازہ علامہ کے اس جملہ سے ہوسکتا ہے لکھا ہے۔

"حیدرآباد جب میرا جانا ہوتا، مرحوم باصرار مدعو کرتے اور ماحضر پیش فرماتے اور طعام وکلام دونوں سے بہرہ اندوز کرتے[1]"

مہاراجہ کشن پرشاد

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد اسلامی تصوف سے بہت متاثر تھے، انھوں نے حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ کی معرکتہ الآرا تصنیف فصوص الحکم کا باضابطہ درس محدث و حکیم مولانا منصور علی خاں مرادآبادی ثم حیدرآبادی (خلیفۂ مجاز حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ) سے لیا تھا، ان کے دربار میں علماء اور فقراء کی بڑی قدر و منزلت تھی، ان کی ذات مغلیہ تہذیب و شائستگی کی آخری یادگار تھی، علامہ کی وہ کیسے قدر نہ فرماتے، علامہ اور مہاراجہ میں خاصہ ربط باہمی محبت اور اعتراف منزلت کا رہا۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے اس کا مختصر مگر جامع ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان سے اس تعلق پر پوری روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس تحریر کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں :۔

"سید صاحب مہاراجہ سرکشن پرشاد کی شرافت، عالی ظرفی اور وضعداری کے بڑے مداح و معترف تھے، جب حیدرآباد جاتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ حیدرآباد سے باہر اپنی جاگیر پر تھے، سید صاحب وہاں جاکر ملے، لکھتے ہیں :۔

"مہاراجہ یمین السلطنۃ بہادر سے ملنے کے لئے ان کی جاگیر اسوال گیا جو حیدرآباد سے بارہ میل پر ہے، مولانا عبدالباری، مولانا مناظر احسن گیلانی اور حکیم الشعراء امجد ساتھ تھے،

---

[1] ایضاً ص ۳۹۵

سر مہاراجہ نے اپنی شرافت طبع اور وضع کی پابندی کی بنا پر، جس کی خاندانی امرا میں وہ آخری مثال ہیں، تالبِ فرش پیشوائی فرمائی۔"

ان کی شرافت اور عالی ظرفی کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حیدرآباد میں کوئی بڑی پارٹی تھی، اس میں حیدرآباد کے تمام ارکان و عمائد شریک تھے، سید صاحب بھی تھے، اتنے میں ریاست کے ایک بڑے عہدیدار تشریف لائے۔ انھوں نے بڑے امرا سے مصافحہ کیا اور سید صاحب کو غالباً مولوی سمجھ کر لنظر انداز کر دیا، مہاراجہ کی نظر پڑ گئی، وہ فوراً سید صاحب کی طرف بڑھے اور خود ان سے مصافحہ کیا، یہ دیکھ کر ان عہدہ دار کو بھی شرما شرمی میں سید صاحب کی طرف بڑھنا پڑا[1]

مہاراجہ بہادر، علامہ کو ہمیشہ قیمتی مندیل، چغہ اور اس قسم کے تحائف پیش فرماتے رہے، اگست ۱۹۳۵ء کے سفر حیدرآباد کے سلسلہ میں علامہ نے جو روئداد اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔ اس میں یہ جملہ بھی موجود ہے۔

"ہز اکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر نے خلعت پارچہ سے نوازش کی"[2]

حضرت مولانا محمد حسین چشتیؒ

حضرت شاہ کمال اللہ چشتی (عرف مچھلی والے شاہ صاحب) قدس سرہ کے خلیفۂ اجل اور حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی قدس سرہٗ کے مسلک عارفانہ کے قالاً و حالاً ترجمان تھے، ان سے علامہ کی واقفیت برسوں کی تھی، مولانا مناظر احسن گیلانی نے (جو حضرت شیخ کے خلیفہ تھے) چاہا تھا کہ علامہ بھی حضرت شیخ سے وابستہ ہو جاتے، اس کے لئے انھوں نے علامہ کے ساتھ ایک خلوت کی مجالست کا اہتمام

---

[1] [2] حیات سلیمان ص ۶۶۸، ۶۶۹

بھی کرایا تھا، مگر علامہ کو ان بزرگ سے مناسبت روحانی نہ مل سکی۔ اس لئے بات آئی گئی ہوگئی۔ پھر برسوں بعد جبکہ علامہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ محبوب بنے اور اوائل ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد تشریف لائے ہوئے تھے تو ایک شام خان بہادر محمد مظہر صاحب (ناظم انسداد رشوت ستانی حکومتِ حیدر آباد) کی خواہش پر علامہ ان کے ساتھ حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں آئے اور یہ راقم بھی خادمانہ طور پر ساتھ تھا، حضرت نے حسبِ عادت توحیدِ باری اور ربطِ خالق و مخلوق پر بڑی دقیق عارفانہ تقریر فرمائی اور ختمِ گفتگو پر علامہ سے فرمایا:

"میں نے آپ کے سامنے یہ تقریر اس لیئے دہرادی کہ اس میں کوئی سقم ہو تو معلوم ہوجائے۔"

علامہ نے ادب سے فرمایا:۔ "تقریر کامل و مکمل تھی۔"

اس پر حضرت نے فرطِ مسرت سے "الحمد للہ" کے کلمات کہے اور پھر ہم ان سے مصافحہ کی سعادت حاصل کر کے لوٹ گئے۔[1] کسے خبر تھی کہ یہ ان دو بزرگوں کی آخری ملاقات تھی، اس کے دوسرے یا تیسرے دن علامہ اعظم گڑھ تشریف لے گئے اور پندرہ بیس روز بعد حضرت محمد حسین صاحب رفیقِ اعلیٰ میں جا پہنچے۔[2]

ابوالحسنات حضرت مولانا سید عبد اللہ شاہ

محدث جلیل، مولف زجاجۃ المصابیح، اور قادری و نقشبندی مجددی سلاسل میں حضرت اقدس سید محمد بادشاہ بخاری حیدر آبادی کے تنہا خلیفہ تھے، بود و باش اور حسن معاشرت میں سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ علامہ سے ان بزرگ کی ملاقات کا ذریعہ راقم عاجز بنا جب مارچ ۱۹۴۴ء میں علامہ حیدر آباد تشریف لائے تھے، یہ ملاقات ۱۴ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو بعد نماز جمعہ مکہ مسجد میں ہوئی اور بلا قیل و قال کی تھی۔ ع

یداں ماندم کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

---

[1] اس کی تفصیل کے لیئے دیکھئے تذکرہ سلیمان (طبع نو) صفحات ۵۰۔۴۸ تا ۵۱۔۴۷ [2] تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات احسانی از مولانا مناظر احسن گیلانی (طبع جدید) حاشیہ بر صفحہ ۱۸

دونوں نے ایک دوسرے کو جان پہچان لیا اور باہم معترفِ عظمت ہوگئے۔[1] پھر اوائل ۱۹۴۵ء میں جب آخری مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے تو ان دونوں آسمانِ ولایت کے ستاروں کو اپنے غریب خانہ کے حجرہ میں جمع دیکھنے کی سعادت بھی اس عاجز نے پائی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس مجالست میں سکوت کا سماں بھی عجیب تھا اور بقدرِ ضرورت تکلم کا لطف بھی عجیب ــــــ اس کے بعد پھر باہم ملاقات کی صورت نہ نکلی، البتہ دونوں کے درمیان سلام رسانی کی برکت و مسرت مجھ بے استحقاق کو حاصل رہی، ایک عریضہ میں میں نے حیدرآبادی بزرگ کا سلام خدمتِ سلیمانی میں پہنچایا تو جوابی نامۂ سلیمانی میں یہ فقرہ تھا کہ

> "حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب کی خدمتِ باسعادت میں اس ہیچمیرز کی طرف سے بھی سلام پہنچا دیں اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ میری بہتری اور حسنِ خاتمہ اور ترقی و تکمیلِ مدارجِ ایمان کے لئے دُعا فرمائیں۔"[2]

عبارت کس قدر بے نفسی بلکہ فنائے تام کی آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی معاصر بزرگ کی منزلت کا اس میں کس قدر پاس و لحاظ ہے!

حضرت امجد حیدرآبادی

حضرت امجد ایک صوفی منش، درویش دل اور نہایت مستغنی مزاج انسان تھے مگر علامہ اور ان کے درمیان خاص ربطِ محبت و عقیدت تھا مشہور عالم تاریخ نصیر الدین ہاشمی کے موسومہ مکتوب بابتہ یکم ستمبر ۱۹۳۵ء میں علامہ کا یہ جملہ اس کی پوری عکاسی کر رہا ہے:-

> "سچ یہ ہے کہ اس دفعہ احبابِ دکن کی محبتوں کا بے حد ممنون رہا خاص کر بے نیاز امجد کی نیاز مندی کے شرف کو اس سفر کا حاصل سمجھتا ہوں۔"[3]

---

[1] اس کی پرکیف تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرۂ سلیمان صفحات ۴۲۶ تا ۴۲۸ [2] ایضاً ص ۴۳۶
[3] نقوش مکاتیب نمبر

علاّمہ نے ان کو "حکیم الشعراء" اور "خیام ثانی" کے القاب بخش کر ان کے کمالِ فن کا اظہار فرمایا تھا اور امجد حضرت علاّمہ کی علمی و روحانی عظمت اور حُسنِ خُلق کے گرویدہ تھے۔ جب کبھی علاّمہ حیدرآباد تشریف لاتے تو حضرت امجد بار بار والہانہ انداز میں ان سے ملنے آتے۔ اپنے گھر مدعو فرماتے اور جب علاّمہ کو وداع کرنے ریلوے اسٹیشن پر آتے تو ایک مختصر سا ناشتہ دان پیش فرماتے۔ راقم نے دیکھا کہ وہ جب بیٹھتے تو علاّمہ کے ٹھیک رُوبرو بیٹھتے، ان کی محبت بھری نگاہیں حضرت علاّمہ کے پُرنور چہرے پر جمی رہتیں، مسرت کی جو موجیں ان کے قلب سے اُٹھتیں وہ ان کے ہونٹوں پر آکر نمودار ہوتیں۔ اِدھر علاّمہ وفورِ حیا سے نظریں نیچی کیے مُسکراتے، پھر باتیں ہوتیں، خیام ثانی اپنی رباعیوں سے علاّمہ کو محظوظ فرماتے۔

ایک مرتبہ علاّمہ بلا اطلاع امجد صاحب کے گھر جا پہنچے، حکیم الشعراء نے جذبات محبت و منت سے مغلوب ہو کر فی البدیہہ یہ رباعی پیش کر دی ؎

از جلوہ حسن خویش حیراں کردی
کافر دل را مگر مسلماں کردی
بنواختی از قدوم خود امجد را
ایں مورِ ضعیف را سلیماں کردی [1]

۱۹۵۳ء کے وسط میں اس راقم کو حیدرآباد دکن کا سفر پیش آیا، حضرت علاّمہ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت امجد سے مل کر علاّمہ کا سلام پہنچاؤں اور ان سے پوچھوں کہ ان کا ارادہ پاکستان آنے کا تو نہیں ہے؟ اس ارشاد کی تعمیل جب میں نے حضرت امجد کی خدمت میں کر دی تو دیکھا کہ دفعتہً ان کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی اور نیم وجد کی حالت میں انھوں نے علاّمہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے

---

[1] علاّمہ نے امجد کے جواب میں اسی پایہ کی یہ رباعی کہی ؎

امجد تو اسیرِ زلف احساں کردی | وز زورِ سخن دلم درخشاں کردی
منت بہ غریب شہر حیدرآں کردی | کاں مورِ ضعیف را سلیماں کردی

(امتحان سلیمان ص۱۰۳)

فرمایا کہ "سب کو بھلا چکا مگر حضرت سلیمان اور مولانا گیلانی کی یاد بس دل میں قائم ہے"، یہ کہتے ہوئے کاغذ کا ایک پرزہ اٹھایا اور اسپر ایک شعر لکھ کر مجھے دیا کہ یہ حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دینا، وہ شعر افسوس کہ اب یاد نہیں، مفہوم اس کا یہ تھا کہ "آپ امجد کو اگر دیکھنا چاہیں تو اپنے نقشِ کفِ پا میں پڑا پائیں گے"۔

نمونے کی ان دو ایک باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے امجد و سلیمان میں کس قدر گہرا قلبی رابطہ تھا۔

بہادر یار جنگ

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ صدر مجلس اتحاد المسلمین کو علامہ سے غایت درجہ عقیدت تھی، وہ مولانا کی محققانہ عظمت، اصابت رائے، فکری عمق اور ان کے زہد و تقوٰی کے اس درجہ معترف تھے کہ ان کی نگاہ میں کوئی اور اس مقام کا نہیں تھا، علّامہ کو بھی بہادر یار جنگ کے اخلاص، تواضع، ذہانت، فکری صحت، تاریخ اسلام پر نظر اور اظہارِ حق میں بے باکی کا پورا اعتراف تھا، اس جواں مرگ قائد کی وفات پر اگست ۱۹۴۴ء کے معارف میں "ایک بہادر مسلمان کی موت" کے زیرِ عنوان علّامہ نے جو مفصل اور پر درد مضمون لکھا ہے اس کا لفظ لفظ راقم عاجز کے قول پر گواہ ہے، ذیل میں چند فقرے درج ہیں:۔

—— "مرحوم سے جان پہچان اور بار بار کی ملاقات تو بارہ تیرہ برس کی تھی، مگر ابھی اسی سال فروری، مارچ اور وسط اپریل تک حیدر آباد میں دارالعلوم ندوہ کے سلسلہ سے تقریباً ان سے روزانہ ہی ملنا جلنا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے پاس آنا جانا اور گھنٹوں بیٹھ کر ہر موضوع پر اظہار خیال کا اور ہر پہلو سے ان کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ہاتھ آیا اور ہر پہلو سے محبوب ہی نظر آتے، ارادے کے پکے، بات کے دھنی، مخلص، وفادار، خداترس، عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مجاہد اسلام، بہادر مسلمان سپاہی اور ہر معنی میں سپاہی، بہادر پٹھان اور بہادر مسلمان"

—— "وہ زبان اور ہاتھ دونوں کے تیز تھے اور اسی کا کرشمہ تھا کہ صرف چند سال کے اندر کشمیر کی پہاڑیوں سے لے کر دکن تک پورے ہندوستان پر چھا گئے۔"

—— "اتفاق دیکھئے چند ہی روز بعد مہا راجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی، بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی تو ایک خوبصورت، سڈول نوجوان شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا اور آداب سے ہاتھ ملا کر گویا ہوا میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں، میں ہوں آپ کا شاگرد محمد بہادر خاں، آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، نا آشنا پایا، تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی کتابوں کو پڑھ کر علم پایا اور خطبات مدراس کو رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا ...... ان کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں، ہزاروں کے مجمع میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی۔"

—— "مرحوم کی تقریر میں فصاحت و بلاغت اور بدائع تینوں کے جوہر تھے ..... ان کی تقریریں بارہا سنیں، ان کی اساس تین چیزیں ہوتی تھیں، اسلامی تاریخ کے معلومات، اقبال کے اشعار اور ابوالکلام کے الفاظ۔"

—— "مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، ان پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا اور وہ یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا ان کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، یہاں تک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے[1] لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں

---

[1] یعنی آخری کراچی مسلم لیگ سیشن (دسمبر ۴۳ء) کے بعد سے جس میں بہادر یار جنگ کی آخری خطابکار تقریر ہوتی تھی۔

پران کی تقریر بار   ہونے لگی تھی۔

میں نے حیدرآباد کے لیڈروں میں ان سے زیادہ ہر دلعزیز کوئی آدمی نہیں دیکھا جس کا سکہ ہر کہ و مہ پر یکساں چلتا تھا۔

"بہادر خاں سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے۔ اس کی ذات سے امت اسلامیہ کو بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں"[1]

اعترافِ عجز

اوپر جن شخصیات کا ذکر ہو چکا، علامہ کے تعلقات ان کے علاوہ اور اشخاص سے بھی تھے، مگر راقم کو ان کی معمولی تفصیلات بھی نہ مل سکیں اس لیئے تذکرہ سے معذوری رہی مثلاً نواب اختر یار جنگ جو وزارت امور مذہبی کے معتمد تھے، ان کے متعلق علامہ سے اتنا سُنا تھا کہ انھیں علم اشتقاق سے دلچسپی تھی اس لیئے ان سے جب علامہ پہلی بار ملے ہیں تو دوران گفتگو انھوں نے اسی فن سے متعلق علامہ سے سوالات کیئے۔ نواب اختر یار جنگ کو معلوم نہیں تھا کہ علم اشتقاق (PHILOLOGY) سے علامہ کو خود بڑا شغف تھا کہ انھوں نے اسکی خاطر عبرانی زبان بھی سیکھی تھی۔ بہر حال علامہ نے ان کے جوابات دیئے اور اس گہرائی سے دیئے کہ نواب صاحب علامہ کی عظمت کے قائل ہو گئے اور پھر بڑے قدر و احترام سے پیش آنے لگے۔

اسی طرح حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب قدس سرہٗ کی تالیف "انوار احمدی"، کا جو ایڈیشن کراچی سے مالکِ مستجاب پریس، حضرت "مستجاب رقم" نے شائع فرمایا ہے، اس کے شروع میں انھوں نے مولف علامہ رحمتہ اللہ علیہ کے جو مختصر حالات تحریر فرماتے ہیں، ان میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت مولانا انوار اللہ صاحب کے تعلقات علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی تھے مگر اس کی تفصیل چونکہ نہ مل سکی اس لیئے یہ عاجز اس سلسلہ میں قارئین کی معلوماتی ضیافت سے قاصر ہے۔ والسلام

---

[1] یادِ رفتگاں صہ ۲۹۳ تا ۳۰۰

ماخذ

۱۔ تاریخ دکن (عہد حالیہ) از ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۲۔ دکنی کلچر از محمد نصیر الدین ہاشمی
۳۔ جامعہ عثمانیہ از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی
۴۔ سرگزشت جامعہ عثمانیہ از بدر شکیب
۵۔ حیاتِ آصف از محمد محبوب جنیدی

۶۔ یادِ رفتگاں (طبع جدید)
۷۔ حیات شبلی
۸۔ خیام
۹۔ مکاتیب شبلی
} از علامہ سید سلیمان ندوی

۱۰۔ ماہنامہ معارف (اعظم گڈھ)
۱۱۔ حیات سلیمان از شاہ معین الدین احمد ندوی
۱۲۔ ماہنامہ نقوش (لاہور) مکاتیب نمبر جلد اوّل
۱۳۔ تذکرہ سلیمان از غلام محمد
۱۴۔ ارمغان سلیمان مرتبہ غلام محمد
۱۵۔ مجلہ صد سالہ یوم پیدائش علامہ سید سلیمان ندوی شائع کردہ دبستان ایسوسی ایشن۔ کراچی
۱۶۔ ذاتی ربط و مشاہدہ

ضمیمہ

چار رقعاتِ سلیمانی جو دو حیدرآبادی

حضرات کے نام لکھے گئے ہیں

ا

تیسرا مکتوب تعلیم نسواں کے بارے میں بہت
توجہ طلب

اور

چوتھا مکتوب متکلمانہ اور صوفیانہ مسئلہ
میں خاصہ ادق اور غور طلب ہے۔

||

نمونہ کے ان دو چار مکاتیب ہی سے حضرت علامہ کی
مورخانہ، محدثانہ، متکلمانہ اور صوفیانہ
جامعیت کا اندازہ
ہو جاتا ہے اور حیدرآباد
تک ان کے فیضانِ علمی
و
روحانی کا پتہ چلتا ہے

بنام مولوی عبدالرحیم صاحب مقیم حمایت نگر حیدرآباد دکن

مولوی صاحب بڑے متقی اور صاحب نسبت بزرگ تھے ساتھ ہی کلامی تصوف سے بھی انہیں خاصی دلچسپی تھی، حضرت علامہ سے انھوں نے مسئلہ "استعداد" کی تفصیل اور مولانا جامی کی ایک رباعی کی شرح دریافت فرمائی تھی، یہ نامۂ سلیمانی اسی کے جواب میں ہے۔

مکرم و محترم ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ الحمدللہ بخیریت ہوں۔

شوق مطالعہ کے ساتھ انشاء اللہ شوقِ عمل میں بھی کمی نہیں ہوتی ہوگی کہ اصل مقصود یہی ہے دھو ولیکم بما کنتم تعملون (الایہ) یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و قربت و ولایت صحت عقائد کے بعد عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ مسائل اصل میں علمِ کلام کے ہیں، حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے مگر حضرات صوفیہ نے ان مسائل میں اپنا خیال بھی ظاہر فرمایا ہے۔ بہرحال حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے اتباع میں اس فقیر ہیچمداں کو ان مسائل سے ازراہِ تصوف کوئی دلچسپی نہیں۔

حضرت والا (تھانوی رح) کے ارشاد کے معنی میرے خیال میں یہ ہیں۔

"استعداد" دو معنی میں بولا جاتا ہے، ایک بمعنی قابلیت اور دوئم بمعنی امکان ذاتی۔ اوّل معنی کی بناء پر استعداد مجعول ہے اور ثانی معنی کی بناء پر استعداد غیر مجعول ہے یعنی استعداد بمعنی اول مجعول ہے کیونکہ وہ وجودی چیز ہے اور استعداد بمعنی دوئم غیر مجعول ہے کیونکہ وہ عدمی ہے اور عدمی غیر مجعول ہوتا ہے اور اس کے غیر مجعول ہونے میں کوئی قباحت نہیں، مقصود یہ ہے کہ افاضۂ نورِ ہدایت کے قبول کی یہ صلاحیت بندوں میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوتی اور دی ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے جبر کے الزام کے رفع کے لیے بعض صاحبوں نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ بندوں میں اچھے اور برے اور سعید و شقی ہونے کا بذات امکان ہے اور امکان ذاتی غیر مجعول ہوتا ہے اور قدیم، اس لیے اچھے اور برے ہونے اور سعید و شقی ہونے کا بندوں

کے طبائع میں امکان اللہ تعالیٰ کے جعل سے نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ امکانِ ذاتی قدیم کے مقتضیٰ کے خلاف کرسکتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے کیونکہ قدیم تبدیلی سے پاک ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر جبر کا الزام نہیں آتا۔ حضرت مولاناؒ اس تاویل یا نظریے کو اس لیے نہیں مانتے کہ اس سے اللہ تعالےٰ کا مجبور ہونا لازم آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا امکان ذاتی قدیم کے خلاف کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

مولانا جامیؒ کی رباعیات کی شرح مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک رسالہ میں کی ہے وہ مجھے نہیں ملا، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔

بندہ ہیچمداں
سید سلیمان

دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۴ء

بنام مشہور مورخ نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد دکن)

(۱)

صاحب الفضل[1]، وعلیکم السلام

عنایت نامہ کا شکریہ۔ سفرنامۂ افغانستان[2] آپ کو پسند آیا ہو تو اس میں آپ کی محبت کی نظر کو دخل ہے۔ حسن لیلیٰ میں نہیں، چشم مجنوں میں ہے۔

دسمبر سے معارف میں بمضمون شذرات تاریخ ہندوستان کی جلدوں کی تعداد و ترتیب لکھی گئی ہے۔ دسویں جلد بہمنیہ و سلطنت ہائے دکن سے متعلق ہوگی، اگر پروفیسر عبد المجید صدیقی[3] اس جلد کو لکھنا چاہیں تو آپ دریافت کر کے مطلع فرمائیے۔ اگر وہ اس جلد کا کام اپنے ذمہ لیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

عہد آصفی کے لیئے سراج الدین صاحب طالب اور ارکاٹ کے لیئے محمد[4] غوث صاحب لکھ سکتے ہیں، مگران کے لیئے چودھویں جلد میں صفحات محدود ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ پچیس پچیس، تیس تیس صفحے۔

"حیات شبلی" لکھی پڑی ہے اور میری فرصت کی منتظر ہے۔ حضرت امجد کی شاعری آپ کا رسالہ ملا، ریویو ہوگا، آپ کی عنایت کا شکریہ۔ تاریخ ہند کی طرف توجہ کیجیے۔ آپ کی پیشگی قیمتوں کے وصول کرنے سے بڑی ذمہ داری آجاتی ہے جس سے ڈرتا ہوں

والسلام　　　　سید سلیمان

---

[1] بیت الفضل، ہاشمی صاحب کے مکان کا نام تھا، اس کی طرف اشارہ ہے [2] حکومت کابل کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی، سر شیخ محمد اقبال اور سر راس مسعود افغانستان گئے تھے۔ یہ سفرنامہ علامہ نے تحریر فرمایا تھا اور پہلی بار نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ [3] پروفیسر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

[4] ایم۔ اے۔ (عثمانیہ)

(۲)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
یکم ستمبر ۱۹۳۵ء

مکرم دام لطفکم۔ السلام علیکم

عنایت نامہ ملا۔ پرسشِ احوال کا شکریہ۔ وہ بچی اپنی حالت سے جانبر نہ ہوسکی، اس کی وفات کی اطلاع مجھے حیدرآباد ہی میں مل چکی تھی، اس لیے چل پڑا۔

میرے حسن سیرت کے ساتھ، اگر وہ ہے، آپ کی گرویدگی خود آپ کے حسن سیرت کی دلیل ہے سچ یہ ہے کہ اس دفعہ احبابِ دکن کی صحبتوں کا بیحد ممنون رہا، خاص کر بے نیاز آمجد کی نیازمندی کے شرف کو اس سفر کا حاصل سمجھتا ہوں۔ کلیاتِ امجد کی ترتیب بساط ضروری ہے۔ یہ امجد کے چمکانے کے لیے نہیں بلکہ امجد کے وجود سے دنیا کو مستفید ہونے کے لیے۔

جی ہاں، جن کتب خانوں کی کتابوں کی فہرستیں نوٹ کی ہیں۔ ان کا ذکر سفرِ دکن کے فوائدِ علمی میں آئے گا۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ کی فہرست چھپ جاتے تو بہتر ہے۔

میں نے غلام غوث صاحب کو ایک کتاب سحرِ حلال مصنفہ ولدِ احمد معمار کے متعلق کتب خانہ مدراس سے دریافت کی فرمائش کی تھی۔ آپ سے ملاقات ہو تو پھر فرمائش کر دیجیے کہ کتاب کا پہلا صفحہ مجھے نقل کر کے بھیجدیں۔

جشنِ سیمیں کی شرکت بعض حالات پر مشروط ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ،

والسلام

سید سلیمان

(۳)

دار المصنفین اعظم گڑھ
۱۵ ستمبر ۱۹۴۳ء

مکرم، السلام علیکم!

جواباً عرض ہے جہاں تک میری نظر ہے، چھوٹی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گھر سے باہر کوئی چہار دیواری مسلمانوں نے نہیں بناتی۔ اور نہ مساجد میں اور نہ کتاب یعنی مکاتب میں وہ لڑکوں کے ساتھ نظر آتیں۔ صرف سواحلِ ہند میں ایک ساحلی شہر تھا، جہاں ابن بطوطہ کو لڑکیوں کے مکاتب نظر آئے۔ اُس کا بیان ہے کہ سواحلِ ہند میں ہنود کے مقام میں ۱۳ مکتب لڑکیوں کے تھے۔ (جلد ۲، صفحہ ۱۳۳ مصر)

عملی تواتر سے جو واقعہ ثابت ہوتا ہے وہ وہی ہے جو صغری خانم کے مدرسہ کا ہے یا یہ کہ امرا اپنی لڑکیوں کے لیے کوئی معلمہ یا مستند و ثقہ و معمر معلم بپابندی پردہ مقرر کرتے تھے جیسا کہ سلاطینِ مغل کی خواتین زیب النسا وغیرہ کے احوال میں ہے۔

بے شبہ اعلیٰ تعلیم جیسے علم حدیث وغیرہ میں یہ طریقہ بھی مذکور ہے کہ مساجد و محافل میں کسی استاد یا محدث کے املا میں عورتیں بھی حاضر ہو کر سنتی تھیں اور روایت کرتی تھیں بلکہ وہ بھی مجلس میں بیٹھ کر املا حدیث کرتی تھیں اور مرد تلامذہ و سامعین ان کو سنتے تھے لیکن پہلی صورت میں عورتوں کا انتظام نشست الگ تھا، اختلاط نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ احادیث میں ہے کہ عورتوں کے لیے الگ انتظام ہوتا تھا اور دوسری صورت میں بیچ میں پردہ حائل ہوتا تھا جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احوال میں ہے یا اگر وہ بہت بوڑھی ہوتی تھیں تو کشفِ وجہہ بھی کرتی ہوں گی مگر تصریح میری نظر میں نہیں۔

یہ بھی تھا کہ باپ اور بھائی اپنی عزیز بیٹیوں اور بہنوں کو خود اعلیٰ تعلیم دیتے تھے اس کی مثالیں بکثرت ہندوستان میں پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں۔ اور بعض فقیہات اسلام کے تذکروں میں بھی ہے بعض اپنے شوہروں سے علم حاصل کرتی تھیں۔

والسلام

سید سلیمان

غلط نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۹	۲	POLITICAL ENLITIES	POLITICAL ENTITIES
۹	۱۵	و	،
۱۰	۷	و	اور
۱۰	۱۹	گی	کی
۱۱	۱۷	PERCEDTION	PERCEPTION
۱۱	۱۹	ہوگئی	ہوگیا
۱۳	۵	طائفہ دگرامی	طائفۂ گرامی
۱۳	۷	کو	میں
۲۵	۵	کی ونتت کا	کی دِقّت کا
۴۲	۱۲	مفروضات	معروضات
۴۷	۲، ۷، ۱۱، ۱۷	مولینا ابوالفار	مولینا ابوالوفار
۴۸	۴	مولینا ابوالفار	مولینا ابوالوفار
۶۰	۲	ہیں کہ	ہیں جن کے
۶۰	۱۰	قدرِ زمین رابہ	قدرِ زمیں رابہ
۷۱	۲	تمام وابسگان ندوہ	تمام وابستگان ندوہ
۸۰	۱	مزاج کے حقیقت کا	مزاج کی حقیقت کا
۶۹		صفحہ نمبر ۶۸	صفحہ نمبر ۶۹
		صفحہ نمبر ۶۹	صفحہ نمبر ۶۸

مکاتیب بہادر یار جنگ

(جلد دوم)

بہادر یار جنگ اکادمی

کی

تازہ ترین پیش کش

یہ اکادمی کے سلسلۂ مطبوعات کی دسویں کڑی ہے
قائد ملت لسان الامت بہادر یار جنگ کے ۲۲۳ خطوط پر
مشتمل یہ کتاب قائد مرحوم کی گوناگوں مصروفیات اور اہم ملی
مسائل پر ان کے افکار و خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب
کے آخر میں سات خطوط ان کے سفر بلاد اسلامیہ سے متعلق ہیں
جو نہایت دلچسپ اور معلومات آفرین ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں عالم اسلام
کی اجتماعی زندگی کا جو عینی مشاہدہ انھوں نے کیا تھا۔ اس
کی حقیقی تصویر ان مکاتیب میں نظر آئے گی۔
کتابت و طباعت معیاری، جلد مضبوط اور سرورق دیدہ زیب
ہے۔ ۲۶۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت صرف
تیس روپے ہے۔

ناشر

بہادر یار جنگ اکادمی

بہادر آباد۔ کراچی نمبر ۵